ریڈیو کے دِن

ایک عالمی نشریاتی ادارے کے براڈکاسٹر کی سرگزشت

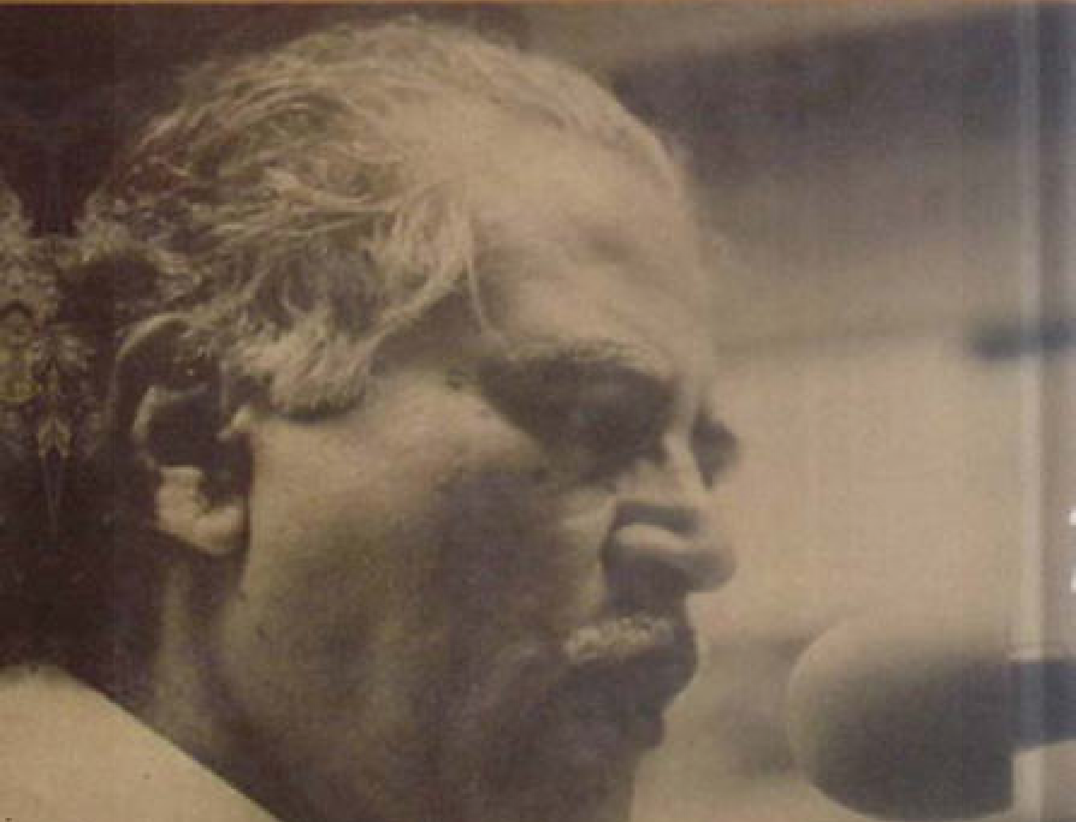

رضا علی عابدی

ریڈیو کے دِن

ایک عالمی نشریاتی ادارے کے براڈ کاسٹر کی سرگزشت

رضا علی عابدی

maablib.org

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.4 Raza Ali Aabdi
Radio Kay Din/ Raza Ali Aabdi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2011.
192pp.
1. Urdu Literature - Autobiography.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2011
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2411-X
ISBN-13: 978-969-35-2411-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

رضا علی عابدی کا تعارف

پچاس برس سے زیادہ عرصے سے ابلاغ عامہ سے وابستہ ہیں۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اخبار سے کیا اور روز نامہ جنگ اور حریت سے وابستہ رہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں محاذ سے رپورٹنگ کی۔ طامسن فاؤنڈیشن کے وظیفے پر برطانیہ میں صحافت کی تربیت پائی۔ 72ء میں پرنٹ میڈیا ترک کر کے بی بی سی لندن کی اردو سروس سے وابستہ ہوئے۔ اخبار کے ڈیسک پر گمنامی کے پندرہ برسوں کے بعد نشریات کے میدان میں آئے تو پہچانے گئے اور ان کی صلاحیتوں کا دنیا کو علم ہوا۔ رضا علی عابدی نے ریڈیو سے تقریباً چوتھائی صدی کی وابستگی کے دوران مختلف نوعیت کے بہت سے پروگرام پیش کر کے غیر معمولی شہرت پائی۔ ان کے پیش کیے ہوئے پروگرام کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا اور ریل کہانی برصغیر کے وسیع علاقوں کے سفر کی بنا پر ترتیب دیے گئے۔ ان دستاویزی پروگراموں کو کتابوں کی شکل بھی دی گئی جو خوب پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پروگرام شاہین کلب نے بی بی سی کے سامعین کو تفریح اور معلومات کا سامان فراہم کیا جس میں سدھو بھائی کے کردار نے اردو دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اس دوران اور 1996ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اردو کا حال، جہازی بھائی، اپنی آواز، جان صاحب، ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم، جانے پہچانے، حضرت علی کی تقریریں اور نغمہ گر کے عنوان سے کتابیں لکھیں۔ برصغیر کے اپنے 1982ء کے پہلے سفر کے تعلق سے ان کی کتاب ''پہلا سفر'' زیر طباعت ہے۔ اپنے جس کام پر انھیں ناز ہے، وہ ان کی لکھی ہوئی بچوں کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں ابتدائی قاعدے سے لے کر کہانیوں اور حکایتوں کے مجموعے تک کتنے ہی موضوعات شامل ہیں۔

رضا علی عابدی اور ان کی اہلیہ ماہ طلعت عابدی لندن میں مقیم ہیں۔

---------O---------

آوازوں کی لہروں پر

ریڈیو کی صدائیں 7

پہلا سبق، آخری سبق 11

کتابیں اپنے آباء کی 24

سدھو بھائی شاہین کلب والے 59

موتی علم وحکمت کے 78

آتے جاتے ساتھی 88

شاہراہ اعظم، قدم بہ قدم 94

چند لمحوں کا یادگار انٹرویو 113

دریا کی گواہی 119

آخری اسٹیشن 151

گلوں کی خوشبو 168

ریڈیو کی صدائیں

جب میں نے ہوش سنبھالا، دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ دنیا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے میرے والد نے مکان کی چھت پر اونچا اسریل لگوایا۔ وہ ایک بڑے سے ریڈیو پر خبریں سنا کرتے تھے۔ اردو میں یہ خبریں ریڈیو برلن سے آیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد ہے ریڈیو تہران اور ریڈیو استنبول سے بھی اردو میں خبریں آنے لگیں۔ مجھے یاد ہے ریڈیو والے خود کو ریڈیو استانبول کہا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ کے پہلو میں یہ پروپیگنڈے کی جنگ تھی جس میں برطانیہ پیچھے رہا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں اگرچہ آل انڈیا ریڈیو اپنی سی کوشش کر رہا تھا مگر دتی میں برطانوی حکام کا اصرار تھا کہ اس پروپیگنڈے کا جواب براہِ راست لندن سے آنا چاہیے۔

آخر طے پایا کہ بی بی سی سے ہندوستانی زبان میں خبریں نشر کی جائیں۔ مئی 1940ء میں بی بی سی لندن میں چھوٹا سا ہندوستانی سیکشن قائم ہو گیا جس کے کرتا دھرتا لوگوں میں ہمارے ذوالفقار علی بخاری بھی شامل تھے جو بمبئی سے لائے گئے جہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کے مقامی اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے۔

11 مئی 1940ء کو لندن سے پہلا خبرنامہ نشر ہوا۔ پانچ منٹ کا یہ خبرنامہ بخاری صاحب نے پڑھا تھا۔ پہلے یہ خبریں ہفتے میں صرف دو دن سنائی جاتی تھیں۔ جلد ہی 15 منٹ کا خبرنامہ ہر روز نشر ہونے لگا جسے بیس منٹ کا کر دیا گیا اور نومبر 1941ء میں 45 منٹ کی ہندوستانی نشریات پیش کی جانے لگیں۔ اس کے علاوہ ایک پروگرام صبح کے وقت بھی ہونے لگا جس میں مشرقِ وسطیٰ کے محاذ پر لڑنے والے ہندوستانی فوجیوں کے لیے گراموفون ریکارڈ بجائے جاتے تھے۔ (اُن کا دل بہلانے والے کچھ توے میرے پاس بھی محفوظ ہیں۔)

اس تمہید میں ایک ذرا سا اشارہ یہ بھی چھپا ہوا ہے کہ عالمی نشرگاہوں کی صدائیں لڑکپن

سے ہی میرے کان میں پڑنے لگیں اور جب میں نے کراچی کے ایک اخبار کی ملازمت اختیار کی تو بی بی سی لندن کی خبریں سننے اور ان کو تحریر کرنے کا کام میری ذمہ داری میں شامل ہو گیا۔ بس اس کے بعد بی بی سی میرے لیے کوئی اجنبی مقام نہ رہا۔

میں 1968ء میں صحافت کا ایک چھوٹا سا کورس مکمل کرنے کے لیے لندن آیا اور برطانیہ میں طرزِ زندگی کو قریب سے دیکھ کر ایک ذرا سا خیال ذہن میں آیا کہ کیوں نہ روزگار کا ذریعہ برطانیہ میں تلاش کیا جائے۔ میرے نوجوانی کے کئی دوست برطانیہ میں آباد ہو چکے تھے اور خوش تھے۔

میرے برطانیہ آنے کا سب سے معقول راستہ بی بی سی میں سے گزرتا تھا، لہٰذا میں نے اپنے روزنامہ جنگ کے ساتھی اطہر علی صاحب سے مشورہ مانگا جو سنہ 1959ء میں بی بی سی سے وابستہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے میری غیر معمولی مدد کی اور امتحانوں اور آزمائشوں سے گزرنے کے بعد مجھے بھی اس عالمی نشرگاہ میں شرکت کا پروانہ مل گیا۔

اخباری صحافت کی بارہ سال سے زیادہ کی مشقت اور مسلسل ریاضت کام آئی اور اگرچہ مجھے ریڈیو کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن بی بی سی کو صحافت سے کام تھا۔ میں چُن لیا گیا اور سخت چھان پھٹک کے بعد میں زندگی میں دوسری بار لندن کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ اب یہاں سے ہم آگے چلتے ہیں۔

اخبار میں تقریباً پندرہ سال اور ریڈیو میں چوبیس برس گزارنے کے بعد میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ بی بی سی سے وابستگی کے برس بہت خوشگوار برس تھے۔ مجھے یاد ہے، میرے بچے کہا کرتے تھے کہ ابا روز صبح جب کام پر جاتے ہیں تو کتنے خوش نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی صبح یہ آرزو نہیں ہوئی کہ کاش آج چھٹی ہوتی۔ اور دوسرا سچ یہ ہے کہ کبھی میری طبیعت خراب ہوتی تو عموماً ہفتے اور اتوار یعنی چھٹی والے روز ہوتی تھی۔

جب میں ریٹائر ہوا (1996ء) تو کچھ عرصے بعد ذیابیطس کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اس پر میرے ساتھی وسعت اللہ خاں نے کہا کہ یہ آپ کے لیے ریٹائرمنٹ کا تحفہ ہے۔ یہ علامتیں پہلے بھی رہی ہوں گی مگر ابھریں سبکدوشی کے بعد۔ اس کے بعد بھی میں بارہ سال تک ہفتے میں دو روز خبریں نشر کرتا رہا۔ اس دوران براڈکاسٹنگ میں جدید ٹیکنالوجی آ گئی۔ ریل سے ریل کو چلنے والے ٹیپ کو دیس نکالا مل گیا اور ہر چیز ڈیجیٹل ہو کر کمپیوٹر میں سما گئی۔

مجھے ٹیپ کی ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ کا غیر معمولی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس وقت یہ ٹیپ ایک بلیڈ سے کاٹ کر غیر ضروری آوازیں نکال دی جاتی تھیں اور یہ کام میں بڑی مہارت سے کرتا تھا لیکن پھر ہوا یہ کہ تین چار بڑے دستاویزی پروگراموں کی ایڈیٹنگ کرتے کرتے میری ایک کہنی میں درد رہنے لگا اور جب تک کمپیوٹر نہیں آیا، یہ درد جاری رہا۔

آج کمپیوٹر میں ریکارڈنگ ہوتی ہے اور آواز کو اسکرین پر لہروں کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو آواز چاہیں برقرار رکھیں اور جس آواز کی ضرورت نہ ہو اس پر نشان ڈالیں اور ایک بٹن دبائیں، وہ کوڑے دان میں چلی جاتی ہے۔

بڑی جدید ایجاد ہے مگر سچ پوچھیے تو جو لطف ٹیپ میں تھا وہ کمپیوٹر کے پردے پر کہاں۔ مگر آج کل کے نوجوان براڈ کاسٹر ہم پر ہنسا کرتے ہیں کہ ہم کیسی دقیانوسی مشینوں پر کام کیا کرتے تھے۔

اس ساری تمہید کا ایک مقصد ہے۔

وہ یہ کہ میں اپنی آدھی عمر کے ان تجربات کا دوستوں کی محفل میں ذکر کرتا ہوں تو وہ سب بیک آواز اصرار کرتے ہیں: "اے بھائی! یہ سب کچھ لکھ دو۔" چنانچہ یہ جنوں کی حکایات لکھ رہا ہوں۔ احباب کو بتایا کہ "ریڈیو کے دن" تحریر کر رہا ہوں۔ اس پر فرمائش ہوتی کہ اخباری زندگی کے تجربات کا کیا ہوگا۔ چنانچہ طے پایا کہ قدرت نے مہلت دی تو "ریڈیو کے دن" کے بعد "اخبار کی راتیں" بھی لکھوں گا۔

بس اس لکھنے میں ایک قباحت ہے۔ اس میں لفظ "میں" بڑی کثرت سے آتا ہے جو میری طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ خدا کرے کچھ ایسا ہو جائے کہ پڑھنے والوں پر گراں نہ گزرے۔

یہ تحریر اُن تمام احباب کے لیے ہے جنھوں نے مجھے جانا اور میری محنت کو سراہا۔ میرا خطاب میڈیا سے تعلق رکھنے والوں سے بھی ہے جو دیکھیں کہ کامیابی کی منزلیں طے کرنے کے لیے کس جذبے اور کس احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطالعے کے دوران انھیں جا بجا ایسے اشارے ملیں گے جو ان کی عملی زندگی میں کام آئیں گے۔

اس ضخیم کتاب کا خلاصہ ایک لفظ میں کیا جائے تو وہ ایک لفظ ہے: شکریہ۔ یہ تحریر نہیں اظہار تشکر ہے ان بے شمار سامعین اور قارئین کے نام جو میری کوششوں کو سراہ کر میرے حوصلے بڑھاتے رہے اور جس روز میں مکمل طور پر ریٹائر ہوا اس دن بالکل یوں لگا جیسے وہ سب میری

ناؤ کی طنابیں کھینچ رہے تھے اور جب تک یہ ناؤ ساحل پر نہیں لگی، انہوں نے محبت کی یہ ڈور ٹوٹنے نہیں دی۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو کہوں کہ یہ ڈور آج بھی سلامت ہے۔ آج جب یہ صفحات لکھ رہا تھا تو میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پشاور سے ایک کرم فرما جاوید بادشاہ صاحب کا فون آیا۔ عید کی مبارکباد دے رہے تھے۔ کچھ روز بعد میری سالگرہ ہے اور جانتا ہوں کہ اس روز کراچی سے نواب میاں کا فون ضرور آئے گا۔ شکر ہے میں تنہا نہیں۔

رضا علی عابدی

16 نومبر 2010ء۔ لندن

--------O--------

maablib.org

پہلا سبق، آخری سبق

جب میں نے ریڈیو کی دنیا میں قدم رکھا، یہ بات 1972ء کی ہے اور ہماری تربیت شروع ہوئی تو پہلے پہل یہ گر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو۔

اور جب ریڈیو سے یہ تعلق ختم ہوا، اور یہ بات 2009ء کی ہے، اور میں نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا، تو میں ایک اور ہی نتیجے پر پہنچا۔

اپنی اس تحریر میں وہی نتیجہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ابھی کچھ روز ہوئے برطانیہ کی اوپن یونیورسٹی نے لندن میں بی بی سی کی اردو نشریات کے موضوع پر ایک مجلسِ مذاکرہ کا اہتمام کیا (جسے اس زمانے میں سیمینار کہا جانے لگا ہے) مذاکرے کو قرینے سے آراستہ کرنے کی غرض سے اردو نشریات کو تین زمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ 1940ء سے تقریباً تیس برس تک پہلا دور جس میں پہلے پہل اردو ہندی نام کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ جو نشریات برصغیر کے لیے ہوتی تھیں، وہ ہندوستانی سروس کہلاتی تھیں۔ پھر جب برصغیر تقسیم ہوا تو ان نشریات کا بٹوارا ہوا اور آج جو اردو سروس ہے اسے پاکستانی سیکشن کہا گیا۔ آگے چل کر اس کو اردو سروس کا نام ملا۔

ان برطانوی نشریات کا یہ شروع کا زمانہ تھا جن کا پودا دوسری عالمی جنگ کی خاک سے پھوٹا تھا۔ اس کے بعد اردو سروس کا دوسرا دور آیا جب اس کے سننے والوں کی تعداد کروڑوں میں جا پہنچی۔ یہ دور 1969ء میں شروع ہوا اور تقریباً بیس سال چلا۔ میں اسی دور کا گواہ ہوں۔

اس غیر معمولی مقبولیت میں سب سے زیادہ دخل حالات کو ہے۔ پاکستان کے انتخابات، مشرقی پاکستان کا بحران، ملک کا دو ٹکڑے ہو جانا، بھٹو صاحب کا پھانسی پانا، ایک اور فوجی ڈکٹیٹر کا برسرِ اقتدار آنا، بنگلہ دیش کے بانی کا قتل، ضیاء الحق کا انجام، یہ سارے واقعات ایسے تسلسل سے ہوئے کہ حالات سے واقف رہنے کی انسانی جبلت نے لوگوں کو ریڈیو کی طرف مائل کر دیا۔

کچھ تو یوں کہ اگلی صبح کے اخبار کا انتظار کون کرے اور کچھ یوں کہ اخبار بھی سرکار کا تھا اور ٹیلی ویژن بھی دربار کا۔ غیر جانبداری سے خبریں حاصل کرنے کا ایک ہی بڑا اور موثر ذریعہ رہ گیا تھا اور وہ تھا بی بی سی، لندن۔

اس وقت یہ عالم تھا کہ ہر گھر میں ریڈیو موجود تھا۔ عرب ممالک سے آنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں ٹرانسسٹر ریڈیو ہوتا تھا جس پر بعد میں غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اس غلاف میں بھی جہاں گنجائش ہوتی لچکا گوٹا ٹنک دیا جاتا۔ اسے گھر کے سب سے اونچے مچان پر رکھا جاتا تاکہ بچے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور اس کی سوئی جو بڑے جتن کرکے بی بی سی پر لگائی گئی ہے، وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائے۔

پھر گھر میں وہ کمرہ یا وہ گوشہ تلاش کیا جاتا جہاں بی بی سی کی آواز صاف اور اونچی آتی تھی۔ اس میں بھی مشکل ہوتی تو مقررہ وقت پر ریڈیو گھر کی چھت پر لے جایا جاتا۔ سارے گھر والے اس کے گرد بیٹھتے۔ بعض اوقات پاس پڑوس اور محلے والے بھی آجاتے اور یہ سارا مجمع چپ سادھ کر لندن سے آنے والی خبریں سنتا۔

خبریں ختم ہوتے ہی یہ مجمع ان پر تبصرہ شروع کر دیتا جو کبھی کبھار بھاپیں اٹھنے والے مباحثے کی صورت اختیار کر لیتا اور بعض اوقات مجمع دو گروہوں میں بٹ جاتا۔ ایک کہتا کہ بی بی سی سچا ہے۔ دوسرا کہتا کہ جھوٹا ہے مگر ہر شام ریڈیو کھول کر اس کے سامنے بیٹھتا ضرور تھا۔

صاف اور اونچی آواز سننے کے لیے کچھ لوگ اپنی کاروں میں بیٹھ کر آبادی سے دور چلے جاتے جہاں نہ ٹریفک کا شور ہوتا اور نہ ریڈیو کی آواز میں گڑبڑ۔ کبھی کبھی تو ریڈیو کے گرد جمع ہونے والوں کو چپ سادھ کر بیٹھنے کی اتنی سخت ہدایت ہوتی تھی کہ لوگ شاید سانس بھی آہستہ لیتے ہوں گے۔

پھر اس کیفیت کا ایک دلچسپ منظر اور بھی ہوتا۔ عین خبروں کے وقت علاقے میں خاموشی چھا جاتی اور اس سناٹے میں ہر گھر سے ایک ہی آواز بلند ہوتی۔ بی بی سی لندن کی آواز۔

ایک بار مجھے مکران کے ساحل پر جانے کا اتفاق ہوا جہاں بی بی سی کی نشریات بہت صاف سنائی دیتی تھیں۔ یہ بات شہر پسنی کی ہے۔ بی بی سی کی نشریات کے وقت اتنے بہت سے ریڈیو کھل گئے کہ مجھے کسی ریڈیو کے سامنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے پسنی کے بازار میں چلتے چلتے پورا پروگرام صاف صاف سنا۔

بحران کے ان دنوں میں پورے بھارت، پاکستان، نیپال اور سری لنکا کے لیے بی بی سی

کا صرف ایک نامہ نگار تھا جس نے دلّی کو اپنا مرکز بنایا تھا اور اس کا نام تھا مارک ٹلی۔ پاکستان کے بحران سے لے کر افغانستان پر سوویت یونین کے تسلط تک ہر معاملے کی خبر لندن بھیجنے کی ذمہ داری اسی ایک شخص کے کندھوں پر تھی۔ ایک دنیا مارک ٹلی کے نام سے واقف تھی۔ کہیں کوئی سفید فام نامہ نگار نظر آ جاتا، لوگ اسی کو مارک ٹلی سمجھ بیٹھتے۔ ایسے میں مغربی ملکوں کے چند ایک نامہ نگاروں نے خود کو مارک ٹلی کا نام دے کر خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

مارک ٹلی کی ایک خوبی یہ تھی کہ اسے ہندوستان سے زیادہ ہی لگاؤ تھا اور یہ بات اس نے کبھی چھپائی نہیں۔ دوسری خوبی اس کی یہ تھی کہ اس کی سنائی ہوئی خبر لوگوں کی مرضی کے مطابق نہ ہوتی تو اسے جھٹ جھوٹا قرار دے دیا جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اگلے روز اس کی خبر صحیح ثابت ہوتی۔ وہ ہر شام کہتا کہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے اور ہر شام گالیاں کھاتا۔ اس کی تیسری خوبی یہ تھی کہ اسے اکثر باتوں کی پہلے سے خبر ہو جاتی تھی۔ کہیں کوئی دنگا فساد ہو، وہ پہلے ہی پہنچ جاتا تھا۔ جس رات راولپنڈی کی جیل میں بھٹو صاحب کو پھانسی دی جا رہی تھی اور جنرل ضیاء یوں ظاہر کر رہے تھے کہ جیسے انہیں خبر ہی نہیں، مارک ٹلی جیل کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ لوگوں کو پھانسی سورج نکلنے سے پہلے پہلے دے دی جاتی ہے، اسے یہ سن گن بھی مل چکی تھی کہ شاید کچھ جیالے بھٹو صاحب کو جیل سے نکال کر لے جائیں گے۔ یہی اندیشہ جنرل ضیاء الحق کو بھی تھا۔ چنانچہ بے صبری کے عالم میں وہ صبح کا انتظار بھی نہ کر سکے اور تارا مسیح کو جو زحمت فجر سے ذرا پہلے دی جانی تھی، وہ رات دو بجے ہی دے دی۔

بی بی سی نے طلوعِ سحر سے پہلے ہی دنیا کو خبر سنا دی۔

یہی سبب ہے کہ یہ نشریات ہر جگہ سنی جاتی تھیں۔ ایک بار میں نے اپنے کسی پروگرام میں کہا کہ ہمارے سامعین جہاں کہیں بھی ہوں، شہروں میں دیہات میں، کھیتوں میں کھلیانوں میں، پہاڑوں پر وادیوں میں، جنگلوں میں صحراؤں میں، انہیں ہمارا سلام پہنچے۔

اگلے ہی ہفتے خلیج کی کسی ریاست سے ایک خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ قید خانوں کو تو بھول ہی گئے۔ جیلوں میں بھی آپ کے سامعین موجود ہیں۔

ایک بار میانوالی جیل سے ایک قیدی کا خط آیا۔ اس نے مجھے لکھا کہ میں بھی آپ کا سننے والا ہوں۔ آپ اپنے سامعین سے ملنے جگہ جگہ جاتے ہیں۔ کبھی کسی جیل میں بھی جانا ہوا؟ کبھی میانوالی آئیں تو اس مشہور قید خانہ کا دورہ بھی کیجیے گا۔ بس اک غضب ہوا جس میں قیدی کی

مجبوری تھی۔ ظالم نے اپنا نام نہیں لکھا۔

کرنا خدا کا کیا ہوا جو نہایت مہربان اور بے حد رحم والا ہے کہ ان ہی دنوں مجھے میانوالی جانے کا موقع ملا۔ ایک شام احباب کی نشست میں جیل کے حکام بھی موجود تھے۔ میں نے اس خط کا ذکر کیا اور جیل کے دورے کی خواہش ظاہر کی۔ جواب ملا ''نو پرابلم۔''

اگلی ہی صبح میں جیل گیا مگر اس جانے میں وہ فیض احمد فیض والی دھج نہیں تھی۔ میں حکام کا مہمان تھا جو مجھے قیدیوں سے ملوانے لے گئے۔ ہر وارڈ میں جا کر قیدیوں سے پوچھا گیا کہ عابدی صاحب کو خط کس نے لکھا تھا؟ قیدیوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کسی کے ہونٹوں پر دلوں کو جیت لینے والی وہ ذرا سی مسکراہٹ آ جائے مگر توبہ!

آخر میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ صاحب، میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا، میری خاطر خط لکھنے کی تدبیر کرنے والا قیدی اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے بلایا تھا، آپ نہیں آئے۔

جیل کے حکام بھی کہتے رہے کہ قیدی چپ ہی رہے گا کیونکہ اس نے خفیہ طور پر خط لکھ کر اور جیل سے باہر اسمگل کر کے قواعد کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے وہ اپنا جرم قبول نہیں کرے گا۔

اس چار دیواری کے اندر دل گھبرانے لگا تو میں نے اجازت چاہی۔ حکام نے کہا کہ یہاں آئے ہیں تو پھانسی کے مجرموں کی کال کوٹھری اور پھانسی گھاٹ تو دیکھتے جایئے۔ کئی مجرم سر جھکائے قرآن پڑھ رہے تھے اور انگریزوں کے زمانے کی پھانسی گھاٹ کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہاں آ کر ایک ہی شخص خوش ہوتا ہوگا، ہر پھانسی پر رقم پانے والا جلاد۔ حالانکہ اب تو کتنے ہی لوگ رقم لیے بغیر بھی یہ فرض خوشی انجام دے رہے ہیں۔

یہ تو محض ایک خط کی بات تھی۔ بی بی سی لندن کو موصول ہونے والے خطوں کا قصہ ذرا طویل ہے جس کے لیے ایک اور علیحدہ باب درکار ہے۔ وہی باب اپنے خاتمے پر میرے اس سوال کا جواب فراہم کرے گا کہ ریڈیو سے 35 برس سے زیادہ پرانے تعلق کے بعد میں کس نتیجے پر پہنچا؟

ہوا یہ کہ قدرت نے مجھے ایک عجیب و غریب موقع دیا۔ ریڈیو پر سامعین سے مل کر ایک انجمن سجانے کا موقع۔ اس کی تفصیل کے لیے آگے چلیے۔

انجمن

تحریری اور زبانی آزمائشوں سے گزرنے اور بار بار طبی معائنے کرانے کے بعد جب

بھرتی کی تصدیق ہوئی اور میں کراچی سے لندن پہنچا تو پہلی بار مائیکروفون کو مقابل پایا مگر چونکہ زندگی بھر ریڈیو سنا تھا اس لیے یہ مخلوق کچھ بھیانک نہیں لگی۔ پہلے روز سے ہی پروگرام نشر کرنے لگا اور شروع شروع کی چھوٹی موٹی حماقتوں کے سوا کوئی بڑی بھول نہیں ہوئی۔

عمر بھر ریڈیو سننے کی ذرا سی تفصیل یوں ہے کہ جن دنوں میں نے ہوش سنبھالا میرے والد صاحب روڑکی انجینئرنگ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنا ریڈیو اور گراموفون کا کاروبار شروع کر چکے تھے۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے عروج پر تھی اور گھر میں ریڈیو کی خبریں کثرت سے سنی جاتی تھیں۔ مجھے خبروں سے تو کوئی خاص سروکار نہیں تھا البتہ آل انڈیا ریڈیو دلی سے بچوں کا پروگرام اور سننے والوں کے خطوں کا پروگرام ضرور سنتا تھا۔

خبروں کی حد تک مجھے علامہ اقبال کی وفات کی خبر یاد ہے اور بچوں کے پروگرام کا وہ گانا یاد ہے: ''بی بی مینڈکی ری تو، تو پانی کی مہارانی'' سننے والوں کے خط بھلا کیوں یاد رہتے البتہ ان خطوں کا جواب دینے والے کا لب ولہجہ کانوں کو بھلا لگتا تھا اور دل پر اثر کرتا تھا۔

ہاں تو جب تمام آزمائشوں سے گزر کر ایک نشرگاہ میں خود کام شروع کیا تو یہاں بھی دو چیزیں نمایاں پائیں۔ وسیم صدیقی بچوں کا بے حد مقبول پروگرام شاہین کلب پیش کر رہے تھے اور تقی احمد سید سامعین کے خطوں کا پروگرام انجمن ترتیب دے رہے تھے۔

مجھے کیا خبر تھی جلد ہی یہ پروگرام مجھے سونپ دیے جائیں گے۔ ایک بار تقی احمد سید صاحب بیمار ہو گئے اور ان کا پروگرام انجمن پیش کرنے کے لیے ایسے پروڈیوسر کی تلاش شروع ہوئی جس پر کوئی دوسری ذمے داری نہ ہو۔ اس وقت میں ہی نووارد تھا۔ یہ قرعہ میرے ہی نام نکلا۔ مجھ سے کہا گیا کہ جب تک تقی صاحب واپس نہیں آتے ریڈیو پر سامعین کے خطوں کے جواب تم دیا کرو گے۔

عرضی کا لفظ سنا تو تھا۔ اب اس کا عملی مظاہرہ دیکھا۔ خطوں کا ایک پلندا میرے حوالے کر دیا گیا اور انجمن پیش کرنے کے لیے ضروری باتیں سمجھا دی گئیں۔

مارے اشتیاق کے جھٹ وہ سارے خط کھولے اور پڑھنے شروع کر دیے۔ ان میں تین طرح کے خط تھے۔ اول تعریفی کلمات سے بھرے ہوئے خط۔ ریڈیو پر اپنا نام سننے کے شوقین لوگوں کا خیال تھا پروگراموں کی تعریف کی جائے گی تو خط ضرور نشر ہوگا۔ دوسرے نمبر پر شکایتی خط تھے۔ خط تو بہت تھے مگر شکایت ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ بی بی سی والے آداب عرض کیوں کہتے ہیں،

سلام علیکم کیوں نہیں کہتے۔ اس شکایت کے بھی دو لہجے تھے۔ ایک ذرا دھیما کہ آپ مسلمان ہیں سلام علیکم کہا کریں۔ دوسرا بہت شدید کہ آپ کو شرم نہیں آتی، ولایت جا کر انگریزوں کے پٹھو ہو گئے۔ آپ کے منہ سے سلام علیکم کے الفاظ کیوں نہیں پھوٹتے۔

مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ اس مضمون کے بہت خطوط آئیں گے۔ بہتر ہوگا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔

تیسری قسم کے خط بہت تھوڑے تھے۔ وہ خط جن میں کسی نہ کسی انداز میں انسانی جذبات کا اظہار کیا گیا تھا: والدہ سخت بیمار ہیں، وہ اس حالت میں بھی بی بی سی سنتی ہیں۔ دادا جان چل بسے، آخر روز تک آپ کی خبریں سنتے رہے۔ باجی کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں، اب ہمارے گھر میں آپ کو سننے والوں کی تعداد میں بھی دو کا اضافہ ہو گیا یا کسی چھوٹی سی بچی کا خط، شریر بھائی نے میری گڑیا کی چوٹی کاٹ دی ہے، بتایئے کیا کروں؟

بس میں نے ایسے ہی سارے خط چنے اور زندگی میں پہلی بار پروگرام انجمن پیش کیا۔ پروگرام کا انداز یوں تھا کہ شمیم خط پڑھتی تھیں، میں جواب دیتا تھا۔ شمیم تو شاید جس دن سے اس پروگرام کی بنیاد پڑی تھی، مسلسل خط پڑھا کرتی تھی۔ تقی صاحب سے پہلے یہ پروگرام حسن ذکی کاظمی مرحوم پیش کرتے تھے اور سننے والوں میں دونوں بہت مقبول تھے۔ شمیم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انہوں نے ایک بار بھی ناغہ نہیں کیا۔ ایک مرتبہ بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوئیں تو پروگرام وہیں جا کر ریکارڈ کیا گیا۔

اب جو انجمن میں نے پیش کیا۔ اس کے ڈھب کا اُن خطوں سے اندازہ لگایئے جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ ریکارڈنگ ہوئی، پروگرام نشر ہوا۔ اسٹوڈیو میں یونس واسطی نے سنا اور نشریے کے خاتمے کے بعد اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی اردو سروس کے اس وقت کے سربراہ ٹوئن میسن کے پاس پہنچے اور کہا کہ میری رائے ہے کہ یہ پروگرام مستقل طور پر عابدی صاحب کو سونپ دیا جائے۔

یہی ہوا...... میں انجمن کا "پیش کار" بنا دیا گیا۔ تقی صاحب صحت یاب ہو کر واپس آئے۔ نہایت اعلیٰ خاندان کے شریف النفس انسان تھے۔ کمال کی حس مزاح تھی، انسان دوست تھے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر دوسری ذمہ داریاں سنبھال لیں اور پروگرام انجمن ہر ہفتے اسی نئی سج دھج سے نشر ہونے لگا۔

سننے والوں میں ایک عجیب خوبی تھی۔ وہ جس انداز کے خط نشر ہوتے دیکھتے تھے، خود بھی ویسے ہی خط لکھتے تھے۔ اب جو انسانی رشتوں اور نازک احساسات کے ذکر سے بھرے خط آنے شروع ہوئے تو انجمن پر اور ہی طرح کا نکھار آنے لگا۔ اوپر سے اس انداز کا اثر یہ ہوا کہ اردو سروس کو ملنے والے خطوں کی تعداد بڑھنی شروع ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے میری میز پر خطوں کے انبار لگنے لگے اور چندرہ منٹ کا یہ پروگرام جو ہفتے میں ایک بار نشر ہوتا تھا، دو مرتبہ پیش کیا جانے لگا۔

ان خطوں کا بی بی سی سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا تھا لیکن اس میں جذبات اور احساسات کی جو چاشنی ہوتی تھی، اس نے ایک خاص طرح کے لب و لہجے کو جنم دیا۔ جیسے خط ہوتے تھے، ویسے ہی میرے جواب ہوتے تھے اور ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شمیم بھی ان خطوں میں ویسے ہی احساسات کا رنگ بھرتی تھیں۔

لوگوں نے خصوصاً نوجوانوں نے اپنے گھر اور اطراف کے چھوٹے چھوٹے واقعات لکھنے شروع کیے۔ کامیابیوں کا اعلان سب کرتے ہیں۔ انہوں نے ناکامیوں کا اعتراف کیا اور لکھا کہ امتحان میں کیوں فیل ہوئے۔ والدین کیوں خفا ہوئے، کرکٹ ٹیم نے اپنی گیند سے پڑوسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑا تو اس نے برہم ہو کر پوچھا کہ شیشہ کس نے توڑا؟ "عابدی انکل، میں نے سر جھکا کر کہا، میں نے۔" پڑوسی مسکرا دیا اور کہا کہ تم سچ بولے، اس لیے معاف کیا۔

مطلب یہ کہ ان کے ماحول اور حالات کے اظہار میں صداقت کا رنگ جھلکنے لگا جو سننے والوں کی طبیعت پر خوشگوار اثر چھوڑنے لگا اور انجمن کو ہر سال ملنے والے خطوں کی تعداد چار ہزار سے بڑھ کر چالیس ہزار تک جا پہنچی۔ یہاں تک کہ ہندی سروس والوں کو تشویش رہنے لگی جو مستقل نگاہ رکھتے تھے کہ اردو سروس کے خطوں کی تعداد ان کے خطوں سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

دیکھا دیکھی خط لکھنے پر یاد آیا کہ ایک بار کسی نے طیش میں آ کر خط لکھا اور بی بی سی سے زیادہ ہم عملے والوں پر برس پڑا۔ "آپ لوگ گوروں کے غلام ہیں۔ چند ٹکوں کی خاطر بک گئے ہیں۔ جھوٹی خبریں سناتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن میں زہر گھولتے ہیں اور نوجوانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔"

چونکہ صداقت ہی پروگرام کا حسن بنتی جا رہی تھی۔ ہم نے اسی صداقت کے ساتھ یہ خط نشر کر دیا۔ اس کی مذمت میں اور ہماری حمایت میں آنے والے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ بہت سے ہندی سننے والوں نے اپنی زبان میں خط لکھے اور ہمارے حوصلے بڑھائے.... مگر کچھ لوگوں نے اس خط سے نہ صرف لطف اٹھایا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت زبان میں لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا

کہ ہم شاید اسی طرح کے خط نشر کرتے ہیں۔

اتنا ضرور تھا کہ لوگ گالیاں لکھنے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ ایک دفعہ ایک خط آیا "انتیس کو اتیس کہنے والوں....."

اس گستاخی پر ہم سب کو ہنسی ضرور آئی۔

ایک خط کے ساتھ عجب قصہ ہوا جس کے نتیجے میں ہم عدالت میں طلب کیے جا سکتے تھے۔

ہوا یہ کہ پاکستان سے دو حضرات لندن آئے اور وہ بھی اس شان سے کہ اپنے سامان میں ہیروئن چھپا کر لائے۔ لندن کے ہوائی اڈے پر پکڑے گئے اور تلاشی کے دوران ان کے سامان سے ایک خط برآمد ہوا جو پاکستان سے کسی نے میرے اور پروگرام انجمن کے نام لکھا تھا۔ پولیس والے سمجھے کہ کوئی بڑا سراغ ہاتھ لگا ہے۔ خط کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے سو سو بار پڑھا گیا کہ شاید اس میں کوئی بڑا راز چھپا ہو۔ ساتھ ہی پولیس والوں نے مجھ کو بھی دبوچا اور پوچھا کہ خط لکھنے والا کون ہے اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ میں نے انہیں ویسے ہی کئی ہزار خط دکھا کر بتایا کہ ایسا ہی ایک خط ہے جو کسی سامع نے لکھا ہے اور چلتے ہوئے ان لوگوں کو تھما دیا کہ لندن جا کر عابدی صاحب کو دے دینا۔

پولیس نے کہا کہ یہی بات عدالت میں جا کر دہرا دو گے؟ مجھے جھٹ راضی ہوتا دیکھ کر انہوں نے بات وہیں ختم کر دی۔ البتہ جب دونوں مسافروں کو سزا ہوئی تو انہوں نے مجھے خوشخبری سنائی۔

حیرت ہے کچھ لے دے کر یا کسی بااثر شخص کے ٹیلی فون پر انہیں چھوڑا نہیں، یہ کیسی پولیس ہے؟

ہمارے پروگراموں میں کبھی کبھی تحریری مقابلے بھی کرائے جاتے تھے۔ انگلستان کی ایک شہزادی کی شادی ہو رہی تھی۔ ہمارے نگراں صاحب کی رگ پھڑکی اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ سننے والوں کو شہزادی کا سہرا لکھنے کی دعوت دی جائے۔ شاعروں کی تو یوں بھی کمی نہیں۔ دیکھیں ہمارے سامعین کیسی کیسی سخن آرائی کرتے ہیں۔

لیجیے صاحب، اعلان ہوتا تھا کہ ڈاک میں شہزادی اور ان کے دولہا کی شان میں سہرے آنے لگے۔ اس سلسلے کا پہلا خط ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس وقت کے صوبہ سرحد سے کسی پٹھان نے ایک شعر کا سہرا لکھا۔

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس سارے عمل میں دلوں کی قربت نے ایسی شکل اختیار کی کہ زیادہ تر خطوں میں مجھے نام لے کر مخاطب کیا جانے لگا۔ ایک خط پاکستان کے قبائلی علاقے سے کسی نوجوان نے لکھا "عابدی صاحب، ہم لوگوں نے تھوڑی بہت تعلیم پالی ہے لیکن ہماری ماں بالکل ان پڑھ ہے اور اسے اردو بالکل نہیں آتی۔ اس نے کہا ہے کہ رضا علی عابدی کو لکھو کہ وہ جو خبریں پڑھتا ہے وہ میری سمجھ میں آجاتی ہیں۔"

میں نے وہ خط تمغہ بنا کر اپنے سینے پر سجا لیا۔

انجمن میں کبھی کبھی سنجیدہ بحث بھی چھڑی۔

کسی نے لکھا کہ جب ہندوستان دو ٹکڑے ہو گیا تو اصولاً اس کا نام ہندوستان نہیں رہا۔ آپ اسے بھارت کہا کیجیے۔

میں نے سوال اٹھایا کہ کیا جب کوئی ملک دو ٹکڑے ہو جائے تو اس کا نام بدل جایا کرتا ہے؟

کسی نے لکھا کہ یہ عورتیں بازاروں میں گھومتی پھرتی ہیں، انہیں ان کے گھروں کی چار دیواری میں بند کیا جائے۔

میں نے کہا کہ کیوں نہ آپ اپنے اندر کے وحشی کو اپنے وجود کے اندر بند کرلیں۔

ایک بار باتوں باتوں میں دین اور عقیدے کا ذکر آ گیا۔ اس پر کراچی سے ایک انقلابی گھرانے کی خاتون کا خط آیا جنہوں نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس روز پندرہ منٹ کے پروگرام میں وہی ایک تنہا خط تھا اور اس کا جواب تھا۔ چند لفظوں میں وہ جواب یہ تھا کہ جس زمانے میں جادوگری کا زور تھا۔ اس دور کے انبیاء نے ویسے ہی معجزے دکھائے اور جب طب اور معالجے نے زور پکڑا تو اس دور کے نبی نے مریضوں کو اچھا اور مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے دکھائے لیکن جب علم و آگہی کا دور شروع ہونے لگا اور آسمان سے پہلی آیت اتری تو اس میں پڑھنے، قلم کا اور کتاب کا ذکر تھا۔ لوگ اپنے پیغمبرؐ سے مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھایئے تو آسمان سے صدا آتی تھی کہ یہ کتاب ہی ہمارا معجزہ ہے۔ یہ بات طے ہے کہ یہودیت کی بنیاد خوف پر، عیسائیت کی بنیاد پیار پر اور کوئی مانے یا نہ مانے اسلام کی بنیاد علم پر رکھی گئی۔

میرا یہ طویل جواب پاکستان کے سب سے بڑے اخبار نے حرف بہ حرف شائع کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اخبار نے نہ میرا حوالہ دیا اور نہ میری نشرگاہ کا۔

اس طرح کی گفتگو چل نکلی تو بی بی سی کے حکام بالا کو تشویش ضرور ہوئی ہوگی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ یہی اس ادارے کی بڑی خوبی تھی۔

پروگرام انجمن نے بی بی سی کو بے شمار دوست دیے۔ بھوپال کے جہاں قدر چغتائی اور کراچی کی ستارہ جبیں قاضی تو ہم لوگوں سے ملنے لندن آگئے۔ ناظم آباد کراچی سے ایک لڑکی آندھی آئے یا طوفان، اردو سروس کو خط ضرور لکھتی تھی۔ ہم لوگوں سے ریڈیو پر کوئی بھول چوک ہو جائے تو ڈرتے تھے کہ اب اس لڑکی کا خط آئے گا اور ہم سے جواب طلبی ہوگی۔

ایک بار یہ ہوا کہ پورے نشریے کے خاتمے پر خاص خاص خبروں کا خلاصہ پڑھنے کے لیے میں اسٹوڈیو کی طرف دوڑا اور سیڑھیاں تیزی سے چڑھتا ہوا اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ اگلے ہی لمحے خلاصے کا اعلان ہوگیا۔ اب جو میں نے خاص خاص خبروں کی سرخیاں پڑھنا چاہیں تو سانس اس بری طرح پھولی ہوئی تھی کہ لگتا تھا یہ میری زندگی کی آخری سرخیاں ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئیں اور اسٹوڈیو کی سرخ بتی بند ہوئی تو میرے ساتھی نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ گھبرایئے نہیں۔ اتنی تاخیر سے سرخیاں کون سنتا ہے۔

میں نے ہانپتے ہوئے کہا" دیکھتے جایئے، ناظم آباد کراچی سے خط روانہ بھی ہو چکا ہوگا۔"

ریڈیو پر میری آواز سن کر لوگ ذہن میں تصویریں بناتے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ میری گفتگو سننے والوں کے ذہن میں میری خوشگوار تصویر ہی بنتی ہوگی۔ ان ہی دنوں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا اور مجھے پاکستان ٹیلی وژن کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ شرکت کر کے میں واپس لندن پہنچا ہی تھا کہ کراچی سے ایک لڑکی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ عابدی صاحب، آپ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ یہ صورت شکل اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ اب آپ صبر کیجیے۔

ایک بار کہیں سے کسی لڑکی کا خط آیا جس نے میری آواز پر تبصرہ کیا تھا۔ اس نے لکھا کہ جوں ہی ہم آپ کی آواز سنتے ہیں، لحاف میں گھس جاتے ہیں۔

دفتر کے شریر ساتھیوں نے لڑکی کا خط نوٹس بورڈ پر لگا دیا۔

بے شمار سننے والے اپنے خطوں میں اصرار کیا کرتے تھے کہ آپ کبھی ہماری طرف آئیں تو ہم سے ملاقات ضرور کریں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، میں نے ہندوستان اور پاکستان جا کر

اتنے بہت سے سامعین سے ملاقاتیں کیں کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے۔ میں نے ہمیشہ کہا کہ یہ میرے لیے کسی سعادت سے کم نہیں کہ میرے ذہن میں سننے والے کی تصویر بہت واضح ہے۔ میں ریڈیو پر بولتا ہوں تو مجھے صاف محسوس ہوتا ہے کہ دوسری طرف کون مجھے سن رہا ہے۔ اسی کی تاثیر ہے کہ میں ریڈیو پر تقریر نہیں کرتا، باتیں کرتا ہوں اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں وزیرستان کے کسی دور دراز قبائلی علاقے میں رہنے والی وہ خاتون جو اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی، میری پڑھی ہوئی خبریں سمجھ لیتی ہے۔

براڈکاسٹنگ کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ بات ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں اتر جائے۔ پروگرام انجمن نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے سامع اور لندن سے بولنے والے صداکاروں کو محبت کے ایک رشتے میں پرو دیا۔ پچھلے دنوں میں نے اوپن یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہونے والے سیمینار میں یہ بات زور دے کر کہی کہ ہم نے سامعین نہیں جیتے، ہم نے ان کے دل جیتے۔

آخر میں اس خط کا ذکر کرنے سے پہلے جو مجھے بے حد عزیز ہے، یہ بتاتا چلوں کہ میں نے پروگرام انجمن پورے نو سال نشر کیا۔ کتنے ہی سننے والوں کے نہ صرف نام مجھے ازبر تھے بلکہ ان کا خط بھی پہچانتا تھا۔ میانوالی کے قصبے کرشانی سے دو نیازی بہنیں باقاعدگی سے خط لکھا کرتی تھیں جو دور سے پہچانے جاتے تھے کیونکہ وہ اپنی اردو تحریر میں نقطوں کی جگہ ستارے بنایا کرتی تھیں۔ خط لکھنے والوں میں رام پور کے مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور علی گڑھ کے پروفیسر آل احمد سرور سے لے کر کراچی کے مرزا ظفر الحسن تک کتنے ہی اکابرین بھی شامل تھے۔

اب تک یہ تعلق خط اور آواز کا تھا۔ اب اس میں ملاقاتوں کی گرم جوشی شامل ہونے والی تھی۔ بی بی سی والے مجھے برصغیر کے دورے پر بھیج رہے تھے تاکہ اپنے سامعین سے ملوں اور دستاویزی پروگرام "کتب خانہ" کے لیے مواد اکٹھا کر کے لاؤں۔

پروگرام انجمن میرے ایک ساتھی کے حوالے کیا گیا اور میں نے سننے والوں کے خطوں کے پلندے ان کے سپرد کیے۔ وہ کئی روز تک ان خطوں میں سر کھپانے کے بعد حیرت سے بولے۔ عجیب خط ہیں، کسی میں پاس یا فیل ہونے کا ذکر ہے، کسی میں بچے کی ولادت کی اور کسی میں گھر کے بزرگ کے انتقال کی اطلاع ہے۔

یوں پروگرام انجمن تو جاری رہا مگر خود انجمن برخاست ہوگئی۔

سنہ 1981ء اپنے خاتمے کے قریب تھا کہ انجمن میں ایک خط نشر ہوا جس کا مضمون یوں تھا "مکرمی، پچھلے سال اکتوبر کی ایک پیر کو میرا ایک خط انجمن میں نشر ہوا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ میرے گھر میں سبھی خوشیاں موجود ہیں لیکن میرے چمن میں اولاد کا وہ پھول نہیں جو ماں باپ کو راحت بخشتا ہے۔ آپ کے سامعین دعا کریں۔ کیا عجب کہ کسی کی دعا قبول ہو جائے اور اللہ ہمیں اولاد کی دولت سے نوازے تو آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ 23 اگست کو میرے گھر چاندی بیٹی پیدا ہوئی ہے اور میں نے اپنی بیٹی کا نام آپ کی ایک اناؤنسر کے نام پر رضوانہ رکھا ہے۔ انجمن کا اور سامعین کا شکریہ۔ فقط مشرف خاں۔ شورگراں محلہ، اجمیر۔"

میں نے لندن سے چلتے وقت یہ خط بڑی احتیاط سے اپنے تھیلے میں بند کر لیا اور اجمیر پہنچ کر وہ خط ہاتھ میں لیے لیے اور راہگیروں سے راستہ پوچھتا پوچھتا میں اجمیر کے محلہ شورگراں جا پہنچا۔ مشرف خاں کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔

میں نے کہا "میں رضا علی عابدی ہوں۔"

کہنے لگے "میں سمجھا نہیں۔"

اور میں اپنا اتا پتا بتانے والا ہی تھا کہ مجھ سے لپٹ گئے۔ دوڑ کر خاتون خانہ کو اطلاع کی۔ جھٹ پٹ بیٹھنے کا کمرہ آراستہ کیا گیا اور اس بار مجھے اندر لے جانے کے لیے آئے تو ہونٹوں پر ایسا تبسم کہ جس پر بے ساختہ پیار آئے۔ مشرف خاں محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور ترقی کر کے بہتر عہدہ پانے کے لیے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے گھر میں لے گئے۔ بہت قدیم مکان کی اتنی ہی قدیم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم بالائی منزل میں پہنچے جو مشرف خان کا چمن تھا۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا۔ سامنے مسہری پر ایک منی سی سانولی سی اور پیاری سی بچی بالکل نئی فراک پہنے، بال جمائے اور آنکھوں میں بہت سا کاجل لگائے بیٹھی تھی۔

مشرف خاں نے کہا "یہ ہیں رضوانہ۔"

ماشاءاللہ کہہ کر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ کسی اجنبی کی گود میں بچے کم ہی آتے ہیں مگر اس نے مسکرا کر بانہیں پھیلا دیں۔

میں نے جوں ہی ننھی رضوانہ کو گود میں لیا، اس نے آہستہ سے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

ہاں تو جب میں نے ریڈیو کی دنیا میں قدم رکھا اور ہماری تربیت شروع ہوئی تو پہلے پہل یہ گُر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو۔

لیکن حقیقی تربیت گزرتے ہوئے وقت نے کی اور مجھے جو گُر سکھایا، وہ میں نے عمر بھر کے لیے گرہ میں باندھ لیا اور وہ یہ کہ اپنے سننے والوں سے محبت کرو۔

ریڈیو سے میرا تعلق ختم ہوا مگر سینے میں وہ چھوٹی سی لَو اب بھی باقی ہے، اس کی روشنی بھی اور اس کی حرارت بھی۔

----------O----------

maablib.org

کتابیں اپنے آباء کی

اب ایک ایسے ریڈیو پروگرام کا احوال جسے بارہ ہفتے چلنا تھا اور جو تقریباً ایک سو چالیس ہفتے چلا۔ اس کا عنوان تھا: کتب خانہ۔

اور جب یہ پروگرام بند ہوا تو شکوہ کرنے والوں کا ایسا احتجاج بلند ہوا کہ مجھے سرکاری دورے پر ہندوستان، پاکستان جانا پڑا۔ اس کی تفصیل اس باب کے آخر میں۔

پہلی بات تو یہ کہ جب پاکستان کے روزنامہ حریت سے وابستگی کے دوران میں نے بی بی سی کی ملازمت کے لیے درخواست دی اور مجھے اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیا گیا اور طے پایا گیا کہ مجھے سنہ 1972ء کے آخر میں انگلستان جانا ہے تو میرا ذہن اس پروگرام کے منصوبے بنانے لگا۔

مجھے اندازہ تھا کہ برصغیر میں لکھی جانے اور چھپنے والی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری میں موجود ہے۔ مجھے خیال تھا کہ ان میں سے بہت سی کتابیں جو برطانیہ نہ جا سکیں، وہ ضائع ہو گئی ہیں یا اگر موجود ہیں تو ان تک رسائی آسان نہیں۔

ان میں بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں جو بیسیوں مرتبہ شائع ہوئیں اور آج تک نہ صرف ہمارے گھروں میں موجود ہیں بلکہ شوق سے پڑھی بھی جاتی ہیں۔ ان میں باغ و بہار، دیوان غالب اور امراؤ جان ادا جیسی درجنوں کتابیں ہیں۔

لیکن ان میں ایسی کتابوں کا شمار کرنا مشکل ہے جو لوگوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد لکھیں، جو شائع ہوئیں اور پڑھی گئیں۔ اس کے بعد گزرتے وقت کی گرد نے انہیں ڈھانپ لیا اور دنیا انہیں بھول بھال گئی۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ ان ساری ہی کتابوں کو دیکھا جائے۔ ان کو پڑھا جائے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھا جائے اور ریڈیو کے سامعین کو ان کتابوں کا احوال سنایا جائے۔ مثلاً یہ کہ

معروف کتابیں جب پہلے پہل شائع ہوئی تھیں تو کیسی تھیں، دیکھنے میں بھی اور پڑھنے میں بھی۔ مثنوی زہرِ عشق جب لکھنؤ میں شائع ہوئی اور صرف مردانے میں پڑھی جاتی تھی اور عورتوں کو اسے دیکھنے اور پڑھنے کی اجازت نہ تھی تو وہ کیسی تھی۔

اسی طرح میں نے سوچا کہ نظم اور نثر کی کتابیں جو ابتداء میں شائع ہوئیں، ان کی تخلیق میں کیسی کیسی مشقت کی گئی۔ کس طرح انہیں سنوارا گیا اور عوام کے ہاتھوں میں وہ کیونکر پہنچیں اور کس طرح انہیں قبولیت حاصل ہوئی یا یہ بھی ہوا کہ وہ قبولیت کے درجے کو پہنچنے سے پہلے ہی گمنامی کے غار میں جا گریں۔

ذہن میں یہ سارے منصوبے میں نہیں بنا رہا تھا، میری چشمِ تصور بنا رہی تھی کیونکہ ابھی تک میں نے نہ انڈیا آفس لائبریری میں قدم رکھا تھا اور نہ برٹش لائبریری میں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ ہندوستان کے شہر کلکتہ میں اردو کتابوں کی باقاعدہ چھپائی سن 1803ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ چل نکلا اور چھپنے والی ہر کتاب کی چھ جلدیں برطانیہ بھیجی جانے لگیں۔ یہ جلدیں انڈیا آفس، برٹش لائبریری اور آکسفورڈ، کیمبرج، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی یونیورسٹیوں میں جمع ہونے لگیں۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ سمندری جہازوں میں لد کر ہندوستان کی ہر کتاب برطانیہ پہنچی البتہ جو جہاز راہ میں ڈوب گئے ان میں لدی ہوئی کتابیں بھی دریا برد ہو گئیں اور اب نایاب ہیں۔

بی بی سی کی اردو سروس میں شمولیت کے کچھ عرصے بعد میں نے یہ منصوبہ سروس کے اربابِ اختیار کے سامنے رکھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری تجویز کی پذیرائی ہوگی۔ اس کا ایک سبب یہ اصول بھی تھا کہ بی بی سی سے پیش کیے جانے والے پروگراموں کے ذریعے برطانیہ کی تشہیر کسی نہ کسی شکل میں ہونی چاہیے اور ملک کی نیک نامی بھی ہو تو اچھا ہے۔ برطانیہ میں محفوظ قدیم اردو کتابوں کا چرچا ہوگا تو سننے والے واہ واہ کریں گے اور ملکۂ انگلستان کی تعریف و توصیف کریں گے اور کیا عجب کہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا بھی کریں۔

مگر یوں نہیں ہوا۔ شاید میں اپنے معاملے کی اچھی وکالت نہیں کر سکا۔ چنانچہ مجھے تین ماہ دیے گئے یعنی یہ کہ نادر اور نایاب کتابوں کا احوال میں بارہ ہفتوں میں بیان کر دوں۔ میں نے اسے بھی بہت جانا۔ اس کا سبب دلچسپ تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں علم و حکمت کے کتنے بڑے سمندر میں غوطہ زن ہونے جا رہا ہوں۔

یہ بات 1975ء کی ہے۔

اُن دنوں برٹش لائبریری الگ، برٹش میوزیم کی عمارت میں تھی اور انڈیا آفس لائبریری علیحدہ، واٹرلو اسٹیشن کے قریب تھی۔ پہلی میں اردو ذخیرے کے نگراں قاضی محمود الحق اور دوسری میں سلیم قریشی تھے۔ اب برٹش لائبریری کی نئی عمارت بن گئی ہے۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری بھی اٹھ کر اسی عمارت میں چلی گئی ہے۔ اس میں گنجائش بہت ہے اور ساری کتابیں ایک چھت کے نیچے موجود ہیں ورنہ وہ کہیں اور سے لائی جاتی تھیں۔

اپنی تحقیق شروع کرنے سے پہلے میں ان دونوں حضرات سے ملا اور ان سے کہا کہ میں انیسویں صدی میں یعنی 1803ء سے سنہ 1900ء تک شائع ہونے والی اور ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایئے کہ یہ کتابیں کہاں آراستہ ہیں۔

میری فرمائش سن کر وہ زیرِ لب مسکرائے اور بولے کہ پڑھنے والوں کو کتابوں تک جانے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ محفوظ مقام پر احتیاط سے رکھی گئی ہیں۔ کتب خانے کا نظام یوں ہے کہ آپ جا کر کتابوں کے کیٹلاگ اور فہرست دیکھیے۔ جو کتاب دیکھنی ہو اس کے لیے ایک فارم پُر کیجیے اور آپ نے اپنے لیے جو میز کرسی چنی ہے اس کا نمبر لکھیے۔ لائبریری کا عملہ آپ کی مطلوبہ کتاب لا کر آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ اسے دیکھیے، پڑھیے، نوٹس لیجیے مگر خیال رہے کہ لکھنے کا سارا کام آپ کو پنسل سے کرنا ہوگا۔ کتب خانے میں سیاہی اور قلم کا استعمال ممنوع ہے۔

وہ تو زیرِ لب مسکرائے تھے۔ میں زور سے ہنسا اور میں نے کہا کہ بھلا کیوں؟ کہنے لگے کہ کتاب پر پنسل کا نشان بن جائے تو اسے مٹایا جا سکتا ہے لیکن سیاہی کا نشان مٹانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ نشان مٹانے کی کوشش میں کتاب کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سنہ 1803ء میں شائع ہونے والی کتاب کی آج بھی کم و بیش وہی حالت ہے جو سنہ 1803ء میں تھی۔

میں نے کہا کہ چلیے پرانی کتابوں کے کیٹلاگ اور فہرستیں دکھا دیجیے۔ وہ انہوں نے دکھائیں۔ اس روز میرے سامنے دروازہ خاور کھلا۔

انیسویں صدی کیسے بڑے آدمیوں کی کیسی عظیم صدی تھی۔ چھاپہ خانہ نیا نیا تھا۔ لوگوں میں کتب بینی تو کیا، حصولِ علم کا شوق اور شعور کم تھا۔ کیسے کیسے دکھ اٹھا کر اردو ٹائپ بنایا گیا تھا۔ کیسے کیسے جتن کر کے مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا قرآن کا اردو ترجمہ اور کلیاتِ میر تقی میر جیسی ضخیم کتابیں کمپوز کر کے چھاپی گئی تھیں۔ انہیں دیکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ دل ہوتا ہے سیپارہ۔

لیجیے صاحب، تحقیق شروع ہوئی۔ تین کتابوں کے لیے درخواست دی گئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایک ایک جلد میں چار چار پانچ پانچ کتابیں بندھی ہوئی ہیں۔ میں تین کتابیں دیکھنے گیا تھا، کوئی بارہ پندرہ کتابیں دیکھیں۔ اس کو انگریزی میں بونس کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھائی تین برس کی اس جستجو کے دوران میں نے انیسویں صدی میں چھپنے والی تقریباً ساری کتابیں دیکھ ڈالیں۔ میں کتابیں دیکھتا گیا اور حیرت کے سمندر میں ڈوبتا گیا۔

اس میں ایک فائدہ ہوا اور ایک نقصان۔

فائدہ یہ کہ علم اور حکمت کے سیکڑوں نسخے دیکھے اور جس قدر علم سمیٹ سکتا تھا، سمیٹا۔

نقصان یہ ہوا کہ اب تک اپنے جس علم میں کچھ فخر کا عنصر شامل ہو گیا تھا، اس کی پوری عمارت نیچے آ رہی ہے اور اپنی کم علمی کے احساس نے ایسا زور مارا کہ باقی عمر کے لیے کتاب اور کتب بینی میرے وجود کا حصہ بن گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں کم مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور ہوس کا یہ عالم ہے کہ عمر کم ہے اور میرا منہ تکنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ، بہت زیادہ ہے۔

تو کتب خانہ کے عنوان سے پروگرام نشر ہونے لگا۔ اسی روز سے سامعین کے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے بزرگوں کی کتابوں کا ذکر کسی نعمت سے کم نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خط لکھنے والے سامعین دو قسم کے تھے۔ ایک تو وہ جنہیں حصول علم سے لگاؤ تھا اور دوسرے وہ جو کتاب پڑھنے کے معاملے میں ذرا سست ہیں اور کوئی شخص پندرہ منٹ میں کتاب پڑھ کر سنا دے تو سبحان اللہ۔

تعریفوں نے طول کھینچا اور اوپر سے یہ کہ نہایت اعلیٰ طبقے کے اہلِ علم حضرات کے خط آنے شروع ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور، مولانا امتیاز علی خاں عرشی زادہ اور ابنِ انشاء مرحوم کے خطوں نے بی بی سی کی انتظامیہ کو بہت متاثر کیا اور مجھے اشارہ مل گیا کہ بارہ ہفتوں کی پابندی ختم۔ جب تک چاہو پروگرام جاری رکھو اور ہر پروگرام جو صرف دس منٹ کا ہوتا تھا، اس کا دورانیہ بڑھا لو۔

بس پھر جو یہ دامن کشادہ ہوا تو میں کتب خانوں سے جھولیاں بھر بھر کر کتابیں لایا اور باقاعدگی سے سننے والوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں مالا مال کر دیا۔

ابنِ انشاء مرحوم ان دنوں نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے سربراہ تھے۔ انہوں نے

اپنے ادارے کے ماہنامے میں کتب خانہ کے پروگرام قسط وار چھاپنے شروع کر دیے۔ کئی کتابوں نے اہلِ علم حضرات کو چونکایا۔ مثلاً ''جواہر منظوم'' کے عنوان سے ایک کتاب کا ذکر آیا۔ اس میں بچپن کے موضوع پر کچھ نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ پڑھنے کے دوران پتا چلا کہ ترجمے کے بعد یہ نظمیں الہ آباد سے دہلی مرزا غالب کے پاس بھیجی گئیں اور جب ان کی نگاہ سے گزر گئیں تو 1849ء میں شائع ہوئیں۔

یہ پروگرام نشر ہوتے ہی رام پور سے اپنے دور کے جید عالم مولانا امتیاز علی عرشی کا خط آیا کہ غالبیات کے ماہروں کے لیے یہ تو بڑا انکشاف ہے اور جیسے بھی بنے مجھے اس کتاب کی نقل بجھوا دیجیے۔ میں مولانا کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا، کتاب کی نقل انہیں بجھوا دی مگر ان کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کتاب کا اصل نسخہ ہندوستان ہی میں ڈھونڈ نکالا۔

پروگرام کتب خانہ تقریباً ڈھائی سال جاری رہا۔ اس دوران کتنے ہی صداکاروں نے اس میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر ''اندر سبھا'' کے اقتباس ڈرامے کی شکل میں پیش کیے گئے تو اس میں کالے دیو اور سبز پری کے کردار ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے معروف صداکار اور اداکار محمود خاں مودی نے ادا کیے۔ تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے دور میں جب یہ ناٹک کھیلا جاتا تھا تو اس میں عورتوں کے کردار نو عمر لڑکے ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بی بی سی کے اسٹوڈیوز میں یہ فرض محمود خاں مودی نے نبھایا۔

پروگرام میں ایک اور تاریخی کتاب پڑھ کر سنائی گئی جس کا نام ''تاریخ ممتاز'' تھا اور جس میں واجد علی شاہ کے وہ تمام خطوط جمع تھے جو انہوں نے جلاوطنی کے بعد کلکتے میں قیام کے دوران لکھنؤ میں اپنی چہیتی بیوی ممتاز جہاں کے نام لکھے تھے۔ یہ تمام خط سونے چاندی کے پانی سے سجائے ہوئے ورقوں پر کسی خوش نویس نے لکھے تھے اور شاہ اودھ پر جدائی کا جو صدمہ ٹوٹ رہا تھا، اس کا دیانتداری سے اظہار کیا گیا تھا۔ پھر ہوا یہ کہ وہ صدمہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور کتاب کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ان کی تحریروں میں جو بیزاری نظر آنے لگی اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ خط وہ خود لکھنے کی بجائے اپنے کسی اہلکار سے لکھوانے لگے۔

ان خطوں کو ریڈیو پر پڑھ کر سنانے کے لیے خالص لکھنؤ کا لب و لہجہ درکار تھا۔ خوش قسمتی سے ان دنوں مشہور اداکار سعید جعفری لندن میں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اور جی لگا کر واجد علی شاہ کے یہ خط پڑھے۔

یہ وہی دن تھے جب بنگال کے مشہور فلم ساز ستیہ جیت رے اپنی فلم "شطرنج کے کھلاڑی" بنانے کی تیاری کر رہے تھے اور انہیں جس کردار کی تلاش تھی، سعید جعفری اس کے لیے موزوں ترین تھے۔ پھر یہ ہوا کہ سعید جعفری ہندوستان بلا لیے گئے اور فلم میں اپنا کردار انہوں نے اتنی خوبی سے ادا کیا کہ اس کے بعد وہ برسہا برس وہیں رہے اور نجانے کتنی فلموں میں نمودار ہوتے رہے۔

پروگرام کتب خانہ میں حصہ لینے والے صداکاروں میں ہندوستان کی مقبول گلوکارہ اور اداکارہ ایلا اروں بھی تھیں۔ انہوں نے قدیم کتاب لوری نامہ میں لوریاں گا کر سنائیں۔ بارہ ماسہ کا ذکر آیا تو بارہ ماسے گا کر پڑھے اور "جواہر منظوم" میں ماں اور بچے کے جو مکالمے ہیں، ان میں بچے کے منظوم مکالمے ایلا نے پڑھے تھے۔ اس وقت اردو ادائیگی کی ان کی جو تربیت ہوئی تھی، یقین ہے کہ حالیہ فلم "جودھا اکبر" میں بادشاہ کی انا کے مکالمے ادا کرتے وقت ان کے کام آئی ہوگی۔

کتب خانہ کے دوسرے صداکاروں میں یاور عباس، نعمان الحق، سلیمہ ہاشمی، منصور مجو اور راشد اشرف بھی شامل تھے۔ اس کے آخری پروگرام میں ابن انشا مرحوم خود شریک تھے۔ وہ علاج کے لیے لندن آئے ہوئے تھے اور یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ بے شمار لوگوں میں اَن گنت مسکراہٹیں بانٹیں، تب رخصت ہوئے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی فہرستوں اور کیٹلاگ کی۔ کتابیں تو جب دیکھیں، تب دیکھیں۔ فہرستیں دیکھ کر ہی عجب کیفیت طاری ہوئی۔ انیسویں صدی میں جب چھاپہ خانہ تو آ گیا مگر لوگوں میں کتابیں تو کیا پڑھنے ہی کا شعور نہ تھا۔ اس وقت کیسے کیسے جواہر پارے وجود میں آئے۔ لکھنے والوں کی طبیعتیں رواں ہوئیں اور طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔

سچ پوچھیے تو اس صدی کی کتابوں میں دین اور شاعری کی کثرت تھی۔ دین کے موضوع کے تحت ایسے ایسے عنوان نظر آئے:

شریعت کا لٹھ، نور نامہ، الف بائے کریم، آئینۂ قرآن، انوار محمدی، آثار قیامت، بہار جنت، بہشت نامہ، چشمۂ فیض، فیض عامہ، گلزار جنت، ہدایت المومنین، جنت کی کنجی، خدا کی نعمت، قیامت نامہ، مظہر آدم، نور محمدی، راہ اسلام، سیلاب غضب، تاریخ اولیا اور زیور ایمان۔

شعر و شاعری کی وہ بھرمار ہے کہ خدا کی پناہ:

دیوانِ عباس، دیوانِ اکبری، دیوانِ عالم، دیوانِ امیر، دیوانِ امجد، دیوانِ عاشق، دیوانِ اشک، دیوانِ اسیر، دیوانِ اعظم، دیوانِ فقیر، دیوانِ فرخ، دیوانِ غریب، دیوانِ گویا،

دیوانِ حیا، دیوانِ ہوزئہ، دیوانِ حسین، دیوانِ ہشیار، دیوانِ جرار، دیوانِ لطیف، دیوانِ مضطر، دیوانِ مسکیں، دیوانِ نسیم، دیوانِ نیاز، دیوانِ تستی اور یہ سلسلہ زیڈ یعنی دیوانِ ذکی تک اس طرح چلا جاتا ہے کہ انسان پڑھتے پڑھتے ہانپ جائے۔

یہ تو خیر دیوانوں کی بات تھی۔ منظوم قصوں اور مثنویوں کو بھی شمار کرنا مشکل ہے۔ قصہ کالی گوری، بلّی نامہ، چوہے نامہ، قصہ سپاہی زادہ، مثنوی خواب مرزا، مثنوی عابد، مثنوی حبیب، مثنوی سعدین، مثنوی داغِ دل سے لے کر سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق تک کیا نہیں ہے۔ ان کے علاوہ گلدستۂ بیت بازی، پہیلی نامہ، لوری نامہ، جواہر منظوم، بارہ ماسہ فتح بخش، دیوانِ شیریں، دیوانِ چندا سے لے کر کلیاتِ ناسخ، کلیاتِ مومن اور کلیاتِ میر تقی میر تک موجود ہے جو سنہ 1811ء میں چھاپی گئی تھی۔

لیکن ان کتابوں میں اردو نثر کا جو تاریخی شہ پارہ شامل ہے، میرے علم کے مطابق اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا وہ اردو ترجمہ جو مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے سنہ 1790ء میں کیا تھا۔ جب اردو نثر لکھنے کا سرے سے رواج ہی نہیں تھا اور جو نثر لکھی جاتی تھی، اسے پڑھنا اور سمجھنا محال ہے۔ جب میر تقی میر اور سودا جیسے عظیم شاعر اپنی نثر فارسی میں لکھتے تھے اور جب انگریز حاکموں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ گلی کوچوں میں رائج بول چال کی زبان کوئی نہیں لکھتا چنانچہ انہوں نے دلّی سے منشیوں کو بلایا اور کہا کہ عام بولی کی زبان لکھو۔ اس ساری کارروائی سے بارہ تیرہ سال پہلے شاہ عبدالقادر عام بولی ٹھولی میں قرآن کا ترجمہ کر چکے تھے جو اتنا عام فہم تھا کہ بعد میں انگریزوں نے سنہ 1830ء کے لگ بھگ اسے کلکتے سے شائع کیا۔ اردو زبان خصوصاً نثر کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے محقق غالباً اس ترجمے کو ادب میں شمار نہیں کرتے۔ تصور کیجیے کہ جب شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کچھ ایسا ترجمہ کر رہے تھے "یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیزگاروں کے۔" اس وقت شاہ عبدالقادر یہی ترجمہ یوں کر رہے تھے "اس کتاب میں کچھ شک نہیں، یہ راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا، اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔" اس کے علاوہ تفسیر میں تو شاہ صاحب نے بالکل آج کی زبان لکھی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ سورۃ اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔"

غرض یہ کہ جس وقت زبان اردو نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا، ان شاعروں،

ادیبوں، تاریخ دانوں اور اخلاق سدھارنے والوں نے اپنے قلم کو بھی مہمیز دی اور کتاب کے دامن کو علم کے موتیوں سے بھرا۔

برطانوی کتب خانوں کے مطالعے کے دوران یہی بھید پوری طرح کھلا اور بی بی سی جیسے مغربی ادارے سے یہ نیکی سرزد ہوئی کہ اس کے توسط سے یہ موتی خوب خوب لٹائے گئے۔

یہاں اپنے قارئین کے لیے ایک بری خبر یہ ہے کہ اس پروگرام کے چند مسودے گم ہو گئے ہیں لیکن اچھی خبر یہ ہے کہ 140 مسودوں میں سے زیادہ تر محفوظ ہیں۔ میری تحویل میں ہیں اور اگلے مرحلے میں ان کو سنوار کر کتاب کی شکل میں لانے کا ارادہ کہیں نہ کہیں کروٹیں بدل رہا ہے۔

یہاں کچھ ایسی قابل ذکر کتابوں کا احوال کہ جنہوں نے تحقیق کے دوران دل و دماغ کو گدگدایا اور ذہن میں ایک عجیب سی سرشاری بھر دی۔

کون سی کتاب آج کتنی قدیم ہے، میرا خیال ہے اس کا حقیقی احساس بے شمار سنہ لکھنے سے نہیں ہوگا بلکہ پڑھنے والوں کا ذہن ہندسوں میں الجھے گا۔ اس کی بجائے یوں کرتے ہیں کہ چونکہ یہ عبارت سنہ 2010ء میں لکھی جا رہی ہے۔ اس مناسبت سے یوں لکھا جائے گا کہ مثال کے طور پر سنہ 1805ء میں شائع ہونے والی کتاب کو دو سو پانچ سال پرانی یا اسی طرح مثلاً 1825ء میں چھپنے والی کتاب کو ایک سو پچاس سال پرانی کہا جائے۔ یقین ہے اس سے کتاب کی قدامت کا بہتر تصور قائم ہوگا۔ البتہ ساتھ ساتھ قوسین میں اصل تاریخ میں درج کر دی جائے۔ آیئے تو ہمارے بزرگوں نے انیسویں صدی میں کیا کیا لکھا اور کیا کیا پڑھا، آج ہم بھی پڑھیں:

اخلاق ہندی: (1803ء) تقریباً دو سو سات سال پہلے یہ کتاب کلکتے میں چھپی تھی اور اسے فورٹ ولیم کالج کے میر منشی میر بہادر علی حسینی نے فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ کتاب انگریز افسروں کو عام بول چال کی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس لیے اس کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں نصیحت آموز حکایتیں اور فلسفیانہ قصے کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

رفاہ خلائق: (1874ء) ایک سو چھتیس سال پرانی یہ کتاب ضلع جالون کے اعلیٰ افسر سی اے ہیٹن برگ نے لکھی تھی اور گورنمنٹ پریس الٰہ آباد میں چھاپی گئی تھی اور قیمت اس کی دو آنے چھ پائی تھی۔ انہوں نے عمر کا بڑا حصہ سکندر آباد، دکن میں گزارا تھا۔ کتاب کا مرکزی خیال اس کی ابتدائی سطروں سے ظاہر ہوتا ہے جو یوں ہے: ''اکثر ہندوستانی آدمی اپنی پابندی رسوم آبائی سے ایسی آفت و مصیبت میں گرفتار ہیں کہ جن کے سبب سے تھوڑی سی عمر شیریں ان کی تلخ

ہو گئی ہے۔"

نزہت الناظر: (1876ء) ایک سو چونتیس سال قبل یہ کتاب دراصل ایجوکیشن گزٹ، اودھ میں شائع ہونے والے مضامین کا انتخاب ہے جسے مولوی ابوالحسن نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے عنوانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں: کرۂ زمین کا بیان، حب الوطن، اشاعت تعلیم کے فوائد، تقدیر اور تدبیر کی لڑائی، بقائے روح بعد فنائے جسم، کذب کی مذمت، صدق کی مدحت، شرافت عجب جوہر ہے اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

معالجات شافیہ: (1847ء) آج سنہ دو ہزار گیارہ تک یہ کتاب ایک سو تریسٹھ سال پرانی ہو چکی تھی۔ اسے جونپور کے جاگیردار سید تفضل حسین خان نے لکھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لندن میں محفوظ ہے۔ اس میں بھی برصغیر میں رائج بری رسموں کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں ایک طرح کی تحقیقی رپورٹ ہے۔ اس وقت راجپوتوں میں لڑکیوں کو ولادت کے فوراً بعد ہلاک کرنے کی رسم تھی۔ کتاب میں اس کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی ہے۔

مجالس النساء: (1874ء) الطاف حسین حالی کی ایک سو چھتیس سال پرانی یہ کتاب عموماً گمنام ہی رہی۔ حالانکہ ایسی عمدہ، سلیس اور رواں اردو اب دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ کتاب ان دنوں لکھی گئی جب برصغیر میں عورتوں کو تعلیم دینے کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس میں عورتوں کی توہم پرستی کا ایسا عکس اتارا گیا ہے کہ برصغیر کی آزادی سے پورے ایک سو برس پہلے کی تصویر آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے۔

داستانِ جمیلہ خاتون: (1865ء) ایک سو پینتالیس سال پہلے یہ کتاب، دیباچے کے دعوے کے مطابق ممالک مغربی کے ڈائریکٹر تعلیمات مسٹر ایم کیمسن نے لکھی تھی اور کانپور کے مطبع نظامی نے چھاپی تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ قصہ کہانیوں کی کتابیں اتنی لچر ہیں کہ والدین اپنی بیٹیوں کو نہیں پڑھواتے۔ اس غرض سے یہ پاک و پاکیزہ قصہ لکھا گیا ہے جس کا ایک ہی مقصد ہے: ہندوستانی معاشرے کی اصلاح۔

لڑکوں کا کھیل: دس سال کے ایک لڑکے راج بہادر عرف ننھا کی لکھی ہوئی یہ کتاب منشی نولکشور نے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے 1871ء میں چھاپی تھی۔ یہ بچہ کئی کتابوں کے مصنف پنڈت دیبی پرشاد کا بیٹا تھا جس نے شیخ سعدی کی گلستان کا پہلا باب ہی پڑھا تھا کہ اس نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ کتاب لکھ دی۔ کتاب کے کچھ عنوان یہ ہیں: سچ بولنا، جھوٹ بولنا، علم، کنجوسی،

ادب، جہالت، غصہ، ہٹ کرنا، عقل، محبت، غرور، دشمنی، پرہیز، طریق تعلیم اور بھولا پن۔ راج بہادر نے لکھا: ''یہ امر بھی لکھنے کے قابل ہے کہ میری عمر کے دسویں برس اور اس کتاب کا آغاز ایک ساتھ ہوا ہے اور ابھی گلستان کا پہلا باب پڑھتا ہوں، لہٰذا قدر دانوں سے یہ التماس ہے کہ میری عمر اور علم پر لحاظ فرما کر حرف گیری نہ کریں بلکہ اس کو بنظر اصلاح ملاحظہ فرماویں۔ فقط۔''

تہذیب الاخلاق: (1891ء) اخلاقیات کے موضوع پر یہ کتاب اپنے وقت کے عظیم دانشور مولوی محمد ذکاء اللہ نے تقریباً ایک سو بیس سال پہلے لکھی تھی جس میں ہندوؤں کے اخلاق و آداب اور نظریات کو موضوع بنا کر معاشرے کی اصلاح کا درس دیا گیا ہے۔ ایسی شستہ نثر اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں مکارم الاخلاق اور مغربی قوموں کے تعلق سے محاسن الاخلاق بھی لکھی تھیں۔

گلدستہ ریاست: (1894ء) ایک سو پندرہ برس سے زیادہ ہوئے جب اخلاقیات کے موضوع پر یہ کتاب سیٹھ سوامی دیال نے سوچئے کس کے لیے لکھی تھی۔ یہ کتاب رئیسوں، راجاؤں، نوابوں، تعلق داروں اور جاگیرداروں کے لیے اور خاص طور پر ان کے وارثوں اور بیٹوں کے لیے لکھی گئی تھی تاکہ جب وہ گدی سنبھالیں تو یہ کتاب ان کی رہنمائی کرے۔ پونے تین سو صفحوں کی یہ کتاب رئیسوں کے لیے نہایت شان سے چھاپی گئی تھی اور اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔

دھارنا تیاگی: (1870ء) فوجیوں کے لیے لکھی جانے والی ایک سو چالیس سال پرانی اس کتاب کے ساتھ ہم نے کچھ اور کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ مثلاً قواعد لشکری، قواعد سواراں، چاند ماری کی کنجی، نوکری سپاہی وغیرہ۔ دھارنا تیارگی کے مصنف کوئی منشی کنہیا لال الکھ دھاری تھے جن کا لدھیانے میں چھاپہ خانہ تھا۔ ساٹھ سال کی عمر تک وہ بارہ کتابیں لکھ کر چھاپ چکے تھے۔ ان کا ہیرو نپولین تھا اور اس کتاب میں انہوں نے نپولین کے 78 فوجی اصول بیان کیے ہیں۔ کتاب ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں کے لیے لکھی تھی تاکہ وہ اپنی فوجوں کو جدید طرز پر منظم کریں۔

عجائب المخلوقات: (1877ء) آج سے 133 سال پہلے چھپنے والی اس کتاب نے خوب دھوم مچائی تھی اور یہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئی تھی۔ یہ دراصل زکریا ابن محمد قزوینی کے عربی انسائیکلوپیڈیا کا اردو ترجمہ تھا اور اس کے بارے میں ایک فقرے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین و آسمان کی کون سی چیز تھی جس کا اس میں ذکر نہ ہو۔ اس میں فرشتوں کی تصویریں تک شامل ہیں اور بڑے یقین سے لکھا ہے کہ ہماری زمین بیچوں بیچ ٹھہری ہوئی ہے اور چاند، سورج،

سیارے، ستارے سب اس کے گرد گھومتے ہیں۔

عجائب وغرائب: (1867ء) ایسٹرن جمنا کنال کے سررشتہ دار محمد سرفراز خاں عرف گھاسی خاں نے آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے انگریز افسروں کی مدد سے لکھی تھی۔ عجائب المخلوقات میں تو سارے بیانات دیومالائی اور الف لیلوی تھے کہ اکثر کا حقیقت سے دور دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پڑھنے والے اسی کے دیوانے تھے۔ اس کتاب میں انسان اور حیوان کا ذکر ہے مگر سارا کا سارا حقیقت پر مبنی ہے۔ کتاب کا سائز ہمارے اخباروں کے نصف کے برابر ہے۔ کتاب میں ڈیڑھ سو سے زیادہ قلمی تصویریں بھی ہیں جو غالباً محمد علی خاں خوش نویس نے بنائی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سارے چہرے سپاٹ اور جذبات سے عاری ہیں۔

مخزنِ حکمت: (1870ء) اپنے دور کے بڑے مورخ اور مصنف مفتی غلام سرور لاہوری کی یہ کتاب ایک سو چالیس سال پہلے چھپی تھی۔ ان کی عظیم تصنیف تاریخ مخزنِ پنجاب کی طرح اس کتاب میں مقامات، عمارات اور علاقوں کا احوال نہیں بلکہ تاریخ کی 74 نامور شخصیتوں پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے تین حصے ہیں: قدیم زمانے کے علماء، اسلام کے ظہور کے بعد کے علماء اور بادشاہوں کے حالات۔ انڈیا آفس لائبریری میں مفتی غلام سرور کی نظم اور نثر کی آٹھ مختلف کتابیں موجود ہیں۔

آثار الصنادید: (1847ء) ملک و قوم کے محسن سرسید احمد خاں نے دلّی شہر کے بارے میں تقریباً ایک سو ساٹھ برس پہلے جیسی کتاب لکھ دی، نہ اس سے پہلے کوئی لکھ سکا، نہ اس کے بعد لکھ سکے گا کیونکہ اس قدیم شہر کے جن تاریخی کھنڈروں کی انہوں نے ایک ایک اینٹ اٹھا کر مشاہدہ کیا تھا، اب تو وہ اینٹیں بھی ریزہ ریزہ ہو کر شاپنگ پلازوں کے نیچے دفن ہو چکی ہیں۔ 614 صفحوں کی اس کتاب کے چار باب ہیں۔ اول دلّی کے باہر کی عمارتوں کے حال میں۔ دوئم قلعہ معلی کی عمارت کے حال میں۔ باب تیسرا خاص شہر شاہجہاں آباد (پرانی دلّی) کے حال میں اور باب چوتھا دلّی کے لوگوں کے بیان میں۔ آثار الصنادید کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی نے "حیاتِ جاوید" میں جو تفصیل لکھی ہے، وہ سرسید کے معاصرین کا پیار میں ڈوبا ہوا یہ تبصرہ یاد دلاتی ہے کہ سید صاحب دیوانے ہیں۔

تحقیقاتِ چشتی: (1864ء) عجیب و غریب لوگ تھے کہ آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے مولوی نور احمد چشتی لاہوری نے آٹھ سو بہتر صفحوں کی اس ضخیم کتاب میں شہر لاہور کی

تاریخی عمارتوں، مقبروں، مزاروں، قبرستانوں، تکیوں، سمادھیوں، مسجدوں، سرائے اور باغوں کا ایسا احوال جمع کیا ہے کہ بقول شخصے ایک ایک دیوار، ایک ایک کھڑکی اور روشندان تک کی تفصیل موجود ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کے اولیائے اللہ، بزرگوں، پیروں، فقیروں اور سجادہ نشینوں تک کا حال اتنا مفصل ہے کہ اکثر کا شجرۂ حسب ونسب تک درج ہے۔ تحقیقات چشتی میں اولیاء کی کرامات بھی بیان کی گئی ہیں مگر اتنا بڑا اور نیک کام سرانجام دینے والے مصنف کے سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہ رہا ہوگا کہ جن دنوں ان کی کتاب چھپ رہی تھی، شہر لاہور میں ہیضے کی وبا پھیلی اور مولوی صاحب آناً فاناً چل بسے۔

اسی پروگرام میں 185 سال پرانی کتاب "جامع الحکایات" کا تذکرہ بھی تھا جس میں شیخ صالح محمد عثمانی نے گلی کوچوں کی زبان میں تقریباً دو سو حکایتیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ تیس سال میں اس کے چھ ایڈیشن نکلے۔ اب کسی کو اس کی خبر نہیں۔

غرابت نگار: (1876ء) ایک سو تیس سال سے زیادہ پرانی یہ واحد کتاب ہے جسے سرسید کی آثار الصنادید کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔ عبدالحق دہلوی کی اس تصنیف میں پورے برصغیر کی چھ سو سے زیادہ عمارتوں کا حال ردیف وار ہے۔ ان عمارتوں میں قلعے، محل، تالاب، پُل، مسجدیں، مقبرے، مندر، بُرج، مینار، درگاہیں اور باؤلیاں شامل ہیں۔ تقریباً بیس فوٹوگراف کتاب میں چسپاں کر کے ان کے نیچے ان کی عبارت ہاتھ سے لکھی گئی ہے اور یہ سارے فوٹوگراف دھندلے پڑ گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف کے دستخط ہیں اور لکھا ہے کہ جس کتاب پر مولف کے دستخط نہ ہوں (نہوں) وہ مالِ مسروقہ ہے۔

تاریخ راجستان: کسی بے ٹاڈ نامہ راجستان (1877ء) ذرا سا اس دور کی اردو زبان کا مزا چکھیے: "تاریخ راجستان جس کو صاحب ذیشان، مورخ کامل کرنیل جیمس ٹاڈ صاحب بہادر، سابق پولیٹیکل ایجنٹ حصہ مشرقی ریاستہائے راجپوتانہ نے باامداد کتب متداولہ تصنیف کیا اور بعد ملاحظہ و منظوری شاہ جارج چہارم، بادشاہ انگلستان کے سنہ 1829ء میں بمقام لندن طبع ہوئی۔" یہ پہلے انگریزی ایڈیشن کا احوال تھا۔ لکھتے ہیں کہ روسا اور امراء کے دربار اس کتاب کے دیکھنے کے خواہش مند تھے اور بوجہ نہ ہونے ترجمہ کے، مثلِ اسرارِ مخفی، منظرِ ناظرین سے نہاں تھا۔ آخر اعلیٰ حکام کے مشورے پر اور اودے پور کے والی اور سابق دیوان مارواڑ، نواب محمد مردان علی خاں کی کوششوں سے ٹاڈ نامہ راجستان، نہایت عمدہ اردو ترجمہ کرا کے منشی نولکشور نے 1877ء میں ایسی

دلکش کتاب چھاپی کہ راجوں، مہاراجوں کے ہاتھوں میں زیب دیتی ہوگی۔ تاریخی کتاب ہے اور انگریزی میں آج تک شائع ہوتی ہے۔

حال جنگِ کابل: (1851ء) ایک سو ساٹھ سال پہلے یہ کتاب ہندوستان کے ایک فوجی سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری الحیدری نے لکھی تھی۔ وہ انگریزی مہم کے ساتھ 1838ء میں افغانستان کی مہم پر گئے تھے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ اس ملک میں جو کچھ دیکھو اس کو لکھ کر میرے واسطے لانا۔ وہ دو سال بعد واپس آئے اور 134 صفحوں کی یہ کتاب لکھی۔ خوش نویس حضرات اس قسم کی کتابیں نقل کر کے بازار میں فروخت کیا کرتے تھے۔ حال جنگ کابل کی نقل بھی بکنے کے لیے آئی اور کرنل ہملٹن کی بیوہ نے خریدنا چاہی۔ غالباً اس وقت کتاب پر لکھی ہوئی قیمت چھ آنے کو مٹا کر بارہ آنے بنایا گیا۔ اس کا قلمی نسخہ لندن میں محفوظ ہے اور کتاب کیا ہے، ایک عجوبہ ہے۔ اس مہم کے دوران انگریز فوج پر کیا گزری، فدا حسین کی روداد ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندوستانی فوجی کے زاویہ نگاہ کی منہ بولتی تصویر ہے مگر کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں افغانستان میں نظر آنے والے ہر عجوبے کا تعلق حضرت علیؓ سے وابستہ کیا گیا ہے اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ حضرت نے افغانستان میں بہت وقت گزارا۔ ریڈیو پر کتاب کا وہ حصہ پڑھ کر سنایا گیا جس میں فدا حسین خدا جانے کہاں سے یہ خبر لائے کہ لغمان کے قریب کالے پہاڑ کے علاقے میں ایک دیو زمین پر اوندھا پڑا ہے، اس کی پشت پر دو زخم ہیں۔ ''حضرت علیؓ نے اسے سات بار مسلمان کیا اور وہ کافر ہو گیا۔ آخر حضرت نے غصہ ہو کر دو زخم ذوالفقار کے اس کی پیٹھ میں مارے اور فرمایا کہ جب امام مہدی پیدا ہوں گے، اس کو پھر مسلمان کریں گے۔ ہر سال نوروز کے دن ہشیار ہو کر اٹھ بیٹھتا ہے اور اس کے عیال و اطفال جو حاضر ہیں، ان سے پوچھتا ہے کہ حاکم کدام است۔ وہ کہتے ہیں کہ امیر علیہ السلام۔ پھر زمین پر گر پڑتا ہے اور زخم اس کے پھٹ جاتے ہیں۔'' فدا حسین لکھتے ہیں کہ وہ انگریز حکام کے ساتھ دیو کو دیکھنے گئے اور اس کے قد کی پیمائش بھی کی۔ چھبیس ہاتھ کا قد اور نو ہاتھ کا سینہ تھا۔

سامعین نے بار بار فرمائش کر کے کتاب کا یہ حصہ سنا۔

تواریخ یادگار صوبہ دار: (1873ء) ایک سو چالیس سال ہونے کو آ رہے ہیں جب یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ ہو کر چھپی۔ یہ ایک فوجی سیتارام کی اپنی داستان ہے جو معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا اور 48 سال کمپنی بہادر کی ملازمت کی۔ اس سارے عرصے میں اس نے تین

نمایاں کام کیے۔ چھ تمغے پائے، سات زخم کھائے اور ملازمت کے دوران اپنا روزنامچہ لکھا۔ اسی کی مدد سے سیالکوٹ چھاؤنی کے مجسٹریٹ کرنل نارگیٹ نے اس کی داستان لکھی۔ انگریزی میں یہ کتاب آج تک شائع ہوتی ہے اور فوجیوں کو پڑھنے کے لیے دی جاتی ہے۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ اردو والوں کو پھر کبھی اسے چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی ورنہ تاریخی حقائق کی ایسی روداد اہل اردو سے روپوش نہ ہوتی۔

تاریخ عجیب: (1880ء) ایک سو تیس سال بعد یہ پڑھنا عجیب سا لگتا ہے کہ کالے پانی کی سزا پانے والوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ 230 صفحوں کی یہ بہت دلچسپ کتاب منشی محمد جعفر نے لکھی تھی جو انگریزی کچہریوں میں وکالت کرتے تھے اور خود ان کے قول کے مطابق بیٹھے بٹھائے قصوروار قرار دے کر جزائر انڈیمان بھیج دیے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا اور انڈیمان کے جزیروں، سزا پانے والوں اور جزیرے کے پرانے باشندوں کے بارے میں حیرت انگیز باتیں لکھیں۔ اس قسم کی چند کتابیں اب بھی دکانوں میں نظر آجاتی ہیں۔

انتخاب تصانیف، ہندوستانی: (1848ء) کوئی ایک سو ساٹھ برس ہوئے جب یہ کتاب پیرس میں چھپی تھی۔ عظیم مستشرق گارساں دتاسی نے فرانسیسی میں دیباچہ لکھا تھا۔ دو سو تیس سے زیادہ صفحوں کی اس کتاب میں دکھنی شاعری اور اردو نثر کا انتخاب ہے۔ نظم میں قصہ مہرو ماہ، قصہ ماہ منور، شمشاد اور دوازدہ (بارہ) ماسہ اور نثر میں بہادر علی حسینی اور لطف علی ولا کی تحریریں شامل ہیں۔

اس پروگرام میں (1877ء) ایک سو تیس سال سے زیادہ پرانی منشی کاش ناتھ کھتری اکبر آبادی کی کتاب "تذکرۂ زنانِ مشہورِ ہند" بھی گفتگو کا موضوع بنی تھی۔ اس میں تاریخ میں نام پانے والی ہندو خواتین کا احوال جمع کیا گیا ہے جن میں رانی پدماوتی، رانی میرابائی، رانی روپ متی، جودھابائی، رانی کنور، رانی چندا اور رانی جھانسی قابلِ ذکر ہیں۔

تاریخ جدولیہ: (1853ء) چھ سو صفحوں کی یہ بھاری بھرکم کتاب خادم علی ابن مولوی شیخ کرم علی فاروقی نے آج سے تقریباً ایک سو ساٹھ سال پہلے لکھی تھی اور اسے ایک فقرے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں کائنات کے وجود میں آنے سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے عہد تک تمام حالات، واقعات، شخصیتوں اور مقامات کی ترتیب وار فہرستیں یکجا کردی گئی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے چالیس کتابوں سے مدد لی تھی۔ حیرت انگیز تصنیف ہے۔

تاریخ کشمیر: (1846ء) جس عظیم تعلیمی ادارے، دہلی کالج کے بڑے احسانات

ہیں، اس کے منشی اشرف علی نے محمد اعظم کی اس عظیم تصنیف کا فارسی سے ترجمہ کیا۔ اس واقعے کو اب ایک سو ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ 357 صفحوں کی اس ضخیم کتاب کو قدیم اور جدید کشمیر کی نہایت جامع اور مفصل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطالعہ خشک اور اکتانے والا نہیں بلکہ بہت دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ پروگرام کتب خانہ میں تاریخ کشمیر کا ذکر چار ہفتوں تک جاری رہا اور اس کا تفصیل سے مطالعہ کیا گیا۔ یہ کتاب دہلی کالج پریس میں چھپی تھی اور کہتے ہیں کہ کالج اور اس کے چھاپے خانے کا بہت سا علمی مواد 1857ء کی بغاوت کے دوران تلف ہو گیا۔

تاریخِ مخزنِ پنجاب: (1877ء) تاریخ کشمیر کی طرح یہ بھی حیرت انگیز کتاب ہے جو اپنے وقت کے سرکردہ مورخ اور محقق مفتی غلام سرور قریش لاہوری نے لکھی تھی اور ایک سو تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا اسے منشی نولکشور نے شائع کیا تھا۔ تقریباً چھ سو صفحوں کی اس کتاب میں پنجاب کے ایک ایک شہر، ایک ایک قریے، دریاؤں، پہاڑوں، ریاستوں اور رجواڑوں کا بے حد مکمل احوال درج ہے۔ اس میں پنجاب کی مسجدوں، مقبروں، گرجا گھروں، ریل، ڈاک اور تار، پولیس، تعلیم، پیشوں، مذہبوں، بزرگوں، بادشاہوں، تجارت اور صنعتوں تک کی تفصیل جمع ہے۔ اس وقت کے پنجاب میں لداخ اور تبت کے کچھ علاقے تک شامل تھے۔

حملاتِ حیدری: (1849ء) یہ غیر معمولی کتاب ایک سو ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ ہوا کلکتے میں چھپی تھی۔ والیٔ میسور حیدر علی کی زندگی پر یہ کتاب ٹیپو سلطان کے بارہ بیٹوں میں سے ایک شہزادہ محمد سلطان عرف غلام محمد نے مولوی عبدالرحیم سے فارسی میں لکھوائی تھی کہ اس وقت یہی چلن تھا۔ بعد میں شیخ احمد علی گوپاموی نے اس کا ترجمہ کیا اور کلکتے میں مولوی عبداللہ کے مطبع علمی میں اس زمانے کے اردو ٹائپ پر چھاپی گئی۔ کتاب میں حیدر علی کے علاوہ ان کے بیٹے ٹیپو سلطان کی زندگی کے حالات بھی درج ہیں۔ ان کے دور کی اہم دستاویزات اور تصویریں بھی شامل ہیں۔

تاریخِ ممتاز: (1858ء) سونے چاندی کے پانی میں نہائی ہوئی یہ درخشاں کتاب تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کے ذاتی کتب خانے سے نکال کر انگریز حضرات یہاں برطانیہ لائے تھے۔ تاریخ ممتاز ان تیس خطوط کا مجموعہ ہے جو واجد علی شاہ نے اپنی جلاوطنی کے بعد لکھنؤ سے کلکتہ پہنچ کر اپنی سب سے زیادہ چہیتی بیوی ممتاز جہاں کے نام لکھے تھے۔ خود ان کی خواہش پر ان خطوں کے مضمون اس کتاب میں جمع کیے گئے اور کتاب ان کے پاس بھیج دی گئی۔ لکھنؤ کے ایک ماہر خطاط نے اسے لکھا اور گل بوٹوں سے آراستہ کیا۔ پروگرام کتب خانہ میں اس کے سارے خطوط

سرکردہ صداکار سعید جعفری نے پڑھے تھے۔ جس کے بعد مشہور فلم ساز ستیہ جیت رے نے انہیں اپنی فلم "شطرنج کے کھلاڑی" میں شامل کرلیا تھا۔

باغ و بہار: زبان اردو کی اس اولین اور تاریخی کتاب کے تقریباً ساٹھ ایڈیشن میں نے دیکھے ہیں جو لندن میں محفوظ ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1804ء کا آخری 1867ء کا تھا اور یہ سلسلہ آج تک نہیں تھما ہے۔ میر امن دہلوی کا لکھا ہوا یہ قصہ اول روز سے انگریز افسروں کو پڑھایا جاتا تھا۔ میں نے اپنے پروگرام میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کے قصے بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کی نگرانی جان گلکرسٹ نے کی تھی اور اس کی چھپائی خود میر امن کی نگرانی میں ہوئی تھی جن کا کہنا تھا" جان گلکرسٹ صاحب نے لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔" کتاب میں بیان کیا جانے والا قصہ جس قدر دلچسپ ہے، کتاب کی بار بار اشاعت کی کہانی بھی اتنی ہی پُر لطف ہے۔

گل بکاؤلی: (1803ء) یہ مشہور قصہ پہلے پہل فارسی میں لکھا گیا تھا۔ اسے ترجمہ کرنے کا فرض منشی نہال چند لاہوری کو سونپا گیا جو دہلی میں پیدا ہوئے اور روزی کی تلاش میں کلکتے پہنچے۔ کسی طرح فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے جہاں جان گلکرسٹ نے فرمائش کی کہ گل بکاؤلی کے قصے کو ہندی ریختے کے محاورے میں ترجمہ کرو۔ (اس وقت اردو کا نام اردو نہیں تھا) پروگرام میں بتایا گیا ہے کہ گل بکاؤلی کے مختلف ایڈیشن کیسے کیسے چھپے۔

کشمیری پنڈت: (1893ء) ایک سو بیس برس ہونے کو آرہے ہیں جب یہ کتاب کشمیر کے شیو نرائن گرٹو نے لکھی تھی جو جالندھر میں چیف کورٹ کے وکیل تھے۔ کہتے ہیں کہ لاہور میں انجمن کشمیری پنڈتاں نے اپنے سالانہ جلسے میں پڑھنے کے لیے انہیں مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ اب جو وہ کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج اور تاریخی پس منظر لکھنے بیٹھے تو پوری کتاب تیار ہوگئی۔ اس میں ان کی شادی، غمی، روزمرہ رواج اور رسمیں اور اصلاح کے مشورے درج ہیں۔ کہتے ہیں کہ کتاب کے قارئین جو کشمیری قوم کے نہیں ہیں، وہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ہندوستان میں ایک ایسی قوم بھی رہتی ہے جو مصنف کے بقول "عجوبہ روزگار" ہے۔

سفرنامۂ روم و مصر و شام: (1892ء) شبلی نعمانی کی اس تحریر کی اشاعت کو بھی ایک سو

بیس سال ہونے کو آ رہے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ اس کے مزاج اور کیفیت کی تصویر ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترکی کے جس شہر کو اب لوگ دنیا کے وزن پر قسطنطنیہ کہنے لگے ہیں، مولانا نے اس کا صحیح املا "قُس طَمن طی نَہ" لکھا ہے: "1309ھ میں قسطنطنیہ وغیرہ کا طالب العلمانہ سفر کیا۔ سفرنامہ لکھنے کا ارادہ نہ تھا مگر بزرگوں اور دوستوں نے اصرار کیا۔ انہیں یورپ سے سخت شکایت ہے کہ اس نے ہمیشہ یک رخی تصویر کھینچ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات پیدا کیے۔" عجب بات ہے کہ یہ صورتحال آج سوا سو سال بعد بھی جوں کی توں موجود ہے۔ یہ سفرنامہ اور خصوصاً اس کی اردو نثر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس وقت مفید عام پریس آگرہ میں اس کی ایک ہزار جلدیں چھپی تھیں۔ آج کے ناشر پانچ سو جلدیں چھاپ دیں تو غنیمت ہے۔

ملک العزیز اور ورجنا: (1893ء) اردو زبان پر جن اکابرین کا بڑا احسان ہے ان میں مولانا عبدالحلیم شرر کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے ایک سو دو کتابیں لکھیں، نو رسالے جاری کیے اور ان کے مضامین کا کوئی شمار نہیں۔ پروگرام کتب خانہ کے لیے ان کے تقریباً ایک سو بیس سال پرانے ناول ملک العزیز اور ورجنا کا انتخاب کیا گیا۔ ان کی نثر پڑھ کر احساس ہوتا ہے گویا آج لکھی گئی ہے۔ شرر کے بارے میں ایک فقرے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مورخ، مصنف، مترجم، اخبار نویس، مصلح اور سیاح تھے۔ لکھنؤ کے تہذیب و تمدن پر ان کی تحریر حرفِ آخر ہے۔

دربارِ اکبری: (1899ء) ایک سو دس سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب محمد حسین آزاد کی یہ تاریخی اور تاریخ ساز کتاب منظرِ عام پر آئی۔ اردو زبان کے ایسے محسن کم ہی ہوں گے جنہوں نے بچوں کے قاعدے سے لے کر شاعروں کے تذکرے تک کیسے کیسے جواہر پارے رقم کیے۔ ہمارے سامنے دربارِ اکبری کا جو پہلا ایڈیشن ہے اسے لاہور میں آزاد کے پرانے شاگرد ممتاز علی نے شائع کیا اور نہایت دیدہ دلیری سے لکھا کہ اگرچہ یہ تحریر محمد حسین آزاد کی ہے لیکن میں نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے اور سمجھئے کہ یہ کتاب میں نے ہی لکھی ہے کیونکہ اصل کتاب تو آزاد دریائے راوی میں پھینک آئے تھے۔ پروگرام کتب خانے میں اس دیدہ دلیری کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔

اندر سبھا: (1854ء) یہ اردو کا پہلا باضابطہ ناٹک ہے جو تقریباً ایک سو ساٹھ سال پہلے لکھنؤ میں کھیلا گیا۔ اس میں خوب رو لڑکے پریاں بنتے تھے، بڑے کٹھے لوگ دیو کا کردار ادا کرتے تھے اور سب کے بیچ تخت پر راجا اندر کا روپ بدل کر تاجدار اودھ جان عالم پیا، یعنی واجد علی شاہ جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ اب نہ وہ لکھنؤ ہے، نہ وہ لوگ مگر اندر سبھا اور راجا اندر کا نام آج تک

ہے اور گل فام اور سبز پری کے گیت آج بھی گائے جاتے ہیں۔ یہ ڈراما بہت سے شاعروں نے لکھا مگر جو بات سید آغا حسن امانت کی اندر سبھا میں تھی، کسی اور میں نہ تھی۔ پروگرام کتب خانہ میں اُن ہی کی تصنیف کا جائزہ لیا گیا۔ کتاب کا نام ہی "اندر سبھا امانت" پڑ گیا۔

امراؤ جان ادا: (1899ء) مرزا محمد ہادی رسوا نے اردو کا پہلا باضابطہ ناول ایک سو بارہ سال پہلے شائع کیا اور ان کتابوں میں سرفہرست ہے جو آج تک شائع ہو رہی ہیں اور نا معلوم کب تک ہوتی رہیں گی۔ نہایت صاف ستھرا، عمدہ چھپا ہوا یہ ناول لکھنؤ کے شاعر مہادیو پرشاد ور ما اثر کی کوششوں سے شائع ہوا جو کتابیں چھاپتے اور بیچتے تھے۔ امراؤ جان ادا کے سرورق پر لکھا ہے: "ایک طوائف کی سوانح عمری، اُسی کی زبانی جس میں لکھنؤ کے طرزِ معاشرت کی ہو بہو تصویریں، سچے واقعات اور اصلی مقامات کے بعینہٖ نقشے، ہر شخص اور ہر حالت کے مناسب بول چال، اعلیٰ درجے کا ستھرا مذاق۔" رسوا کون تھے، کتاب کیسے کیسے جتن کر کے لکھی گئی، پروگرام میں اس کا احوال بھی تفصیل سے شامل تھا۔

سیرت فریدیہ: (1896ء) اپنے نانا فریدالدین احمد خاں کی زندگی پر یہ کتاب ان کے نواسے سرسید احمد خاں نے لکھی تھی۔ دل پر اثر کرنے والی یہ ستاون صفحوں کی چھوٹی سی کتاب تقریباً 115 سال پہلے مفید عام پریس آگرہ میں چھپی تھی۔ فریدالدین احمد علم و ہنر میں یکتا تھے اور محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار سے فورٹ ولیم کالج تک ان کا شہرہ تھا۔ اس ذرا سی کتاب میں اس دور کی حیرت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے جب مغلوں کا عہد اپنی بساط لپیٹ رہا تھا اور جہاں سرسید نے اپنی ماں کی شخصیت بیان کی ہے وہاں پڑھنے والے کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔

قصہ گل و صنوبر: (1836ء) سوال یہ تھا کہ گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا؟ اور اس کے جواب کی خاطر کتنے ہی شہزادے اپنی جانوں سے گئے۔ بالآخر ہمارا ہیرو شہزادہ ہزار دکھ اٹھا کر اور مصیبتیں جھیل کر اس سوال کا جواب ڈھونڈ لایا کہ گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا؟ یہ قصے اب پرانے ہوئے۔ اب ہم ایسے قصے سن کر ہنستے تھے کہ مغرب کی ایک خاتون نے جادوگروں اور ان کے کرتبوں کا قصہ لکھ ڈالا اور آج کل ایک پوری نسل ہیری پوٹر کی یہ داستان بار بار پڑھ رہی ہے۔ یہ کتاب پونے دو سو سال پہلے نیم چند کھتری نے لکھی تھی۔ اس کی فرمائش بابو گروچرن سین نے کی تھی اور اس کی تصحیح داتا رام برہمن نے کی تھی۔ اس سُنیئے، کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نعت رسول مقبولؐ اور پھر منقبت آل نبی احترام کا مرقع نظر آتی ہے۔

سفرنامہ منشی امین چند: (1854ء) منشی امین چند انبالہ کے باشندے تھے اور تحصیلدار تھے۔ کوئی بھلے مانس ڈپٹی کمشنر رابرٹ کیسٹ صاحب بہادر تھے جنہوں نے منشی سے کہا کہ ہندوستان کے بچوں کو خود اپنے ملک کے شہروں، پہاڑوں اور دریاؤں کا علم ہونا چاہیے۔ اس لیے تم نوکری چھوڑ کر سفر پر نکلو، اپنے ملک کو دیکھو اور اس کا حال لکھو۔ منشی امین چند نے 1850ء میں اپنا سفر شروع کیا اور تین سال تک پنجاب اور بمبئی پریذیڈنسی کے علاقوں کا سفر کیا جس میں آج کا پاکستان شامل ہے۔ اس کے بعد یہ بے حد دلچسپ کتاب لکھی گئی۔ ہمارے شہر، ہمارے گلی کوچے اور ان میں کھیلنے والے بچے آج سے ایک سو ساٹھ سال پہلے کیسی زندگی جیتے تھے، میں نے کتاب کا ایک ایک حرف پڑھا۔

جامع فتح خانی (1849ء) مشہور لوگوں کی سوانح تو اکثر شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہے مگر جنہوں نے بڑا نام نہ پایا ہو یا جلد بھلا دیے گئے ہوں، ان کی سوانح بھی دلچسپ ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال پرگنہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ کے تحصیلدار فتح خان کی زندگی پر ان کے بھانجے نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر ضلع مظفر نگر کی لکھی ہوئی ایک سو ساٹھ سال پرانی یہ کتاب ہے جو دہلی اردو اخبار پریس میں کم سے کم دو بار چھپی۔ اگر کتابوں میں بھی کسی قسم کی حس ہوتی ہے اور اگر کوئی بھولا بھٹکا قاری ایسی کتابوں سے گرد جھاڑ کر انہیں شوق سے پڑھتا ہو تو خدا جانے کتابیں دل ہی دل میں کیا کہتی ہوں گی۔

ملا دو پیازہ کی سوانح عمری: (1893ء) منشی محمد کامل کا ہمارے سامنے تیسرا ایڈیشن ہے جو آج سے تقریباً ایک سو بیس سال پہلے چھپا تھا اور جس نے ایک ایسے شخص کی زندگی پر روشنی ڈالی جسے ہم سب لطیفہ گو مسخرا سمجھتے ہیں اور بہت کم یہ سوچتے ہیں کہ اکبر جیسے عظیم بادشاہ کا قرب اسے کیسے حاصل ہوا۔ یہ کتاب کچھ عربی اور فارسی کتابوں کی مدد سے لکھی گئی ہے اور عربی شہر طائف کے ایک رئیس کے پوتے ابوالحسن سے ہمارا تعارف کراتی ہے جنہیں ہم ملا دو پیازہ کے نام سے جانتے ہیں۔ ابوالحسن کا گھر بار دھوکے بازوں نے لوٹا اور پھر وہ کس طرح ہندوستان پہنچے۔ وہ نہایت عمدہ قاری تھے اور دینی مسائل کے حل بیان کیا کرتے تھے۔ دو پیازہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ ان کی شہرت سن کر ابوالفضل اور فیضی انہیں اکبر کے پاس لے گئے جس نے ملا کے آخر دم تک انہیں عزیز جانا اور قریب رکھا۔

ابوالفضل کی سوانح عمری: (1892ء) تقریباً ایک سو بیس سال پہلے یہ سوانح مولوی

غلام الثقلین نے لکھی اور اردو ادب اور صحافت کے ایک بڑے محسن منشی محبوب عالم نے اپنے کارخانہ پیسہ اخبار، لاہور سے شائع کی۔ چھوٹی سی کتاب ہے جسے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اسے ترتیب دینے میں کتنی بہت سی محنت کی گئی ہوگی۔ اس کی زبان حیرت انگیز طور پر سادہ اور سہل ہے۔ کسی بادشاہ کو ایسے لائق مشیر اور وزیر نہیں ملے ہوں گے کہ جس نے سات برس کی محنت سے اکبرنامہ لکھا اور اس کے ساتھ آئین اکبری ترتیب دیا جس میں پورے ہندوستان کا جغرافیہ ہے اور امریکہ کے دریافت ہونے کی خبر بھی درج ہے۔

پیسہ اخبار۔ منشی محبوب عالم اور ایک کتاب: (1892ء) ایسے لوگ کم ہیں جنہوں نے بیک وقت قوم پر اور اس کی زبان پر احسان کیے ہوں۔ ان میں گوجرانوالہ سے ایک مفلس گھرانے کے غریب بیٹے کا نام شامل ہے اور وہ تھے منشی محبوب عالم جنہوں نے لاہور میں چھاپہ خانہ لگایا اور پیسہ اخبار جاری کیا اور اس طرح ہم لوگوں نے اخبار پڑھنا سیکھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے درجنوں کتابیں چھاپیں مثلاً دنیا کے بڑے بڑے نامور لوگوں کی سوانح شائع کیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے سائنس، تاریخ، ریاضی اور ادب کی کتابیں بھی شائع کیں۔ اس پروگرام میں ان کے مطبع کی کتاب "شرابی کی سچی سرگزشت" شامل تھی جو آج سے تقریباً 120 سال پہلے چھپی تھی اور شراب کی لعنت کے موضوع کو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ بغاوت ہند کے بعد اخلاقی زوال ہوش مندوں کو کتنا ستا رہا تھا، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے۔

جادو، ٹوٹکے اور عملیات: 1857ء کے بعد ہندوستان کا برا حال ہوا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان دنوں شائع ہونے والے جادو، ٹونے، شعبدے، تعویذ گنڈوں، فالناموں، تعبیر ناموں اور عملیات کی کتابوں کا ایک سیلاب سا آیا۔ یہ سارا کوڑا کباڑ برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔ کچھ کتابوں کے نام یوں ہیں: اعجاز احمدی (مصنف اہے پرشاد) اعجاز محمدی (مصنف سیتارام) اسرار الہنود، سُندر ریکھا، ریکھا، سحر الہند، سحر الہنود، سحر بنگالہ، عملیات نادرہ، سحر سامری، اندر جال، تحفۂ طلسمات (مصنف بلاقی داس) وغیرہ۔ سحر بنگالہ میں ایسی رتی بنانے کی ترکیب لکھی ہے کہ اسے کسی آدمی کے گلے میں باندھ دیں تو وہ فوراً گھوڑا بن جائے۔ آپ ایسا ہیولا اُگا سکتے ہیں کہ اسے منہ میں رکھتے ہی آپ سانپ بن جائیں گے اور اسی طرح آدمی کو بکرا، بندر اور بھینسا بنانے کی ترکیبیں بھی درج ہیں۔ ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن نکلے ہیں۔

ظرافت نامہ: (1876ء) کوئی ناصر علی تھے جنہوں نے ایک سو تیس سال پہلے

برطانیہ کے رسالے پنچ سے کچھ مضامین ترجمہ کیے تھے۔ کسی دوسری زبان کے طنز و مزاح کا ترجمہ آسان نہیں مگر ناصر علی نے ظرافت نامہ میں حیران کن ترجمہ کیا ہے۔ اس میں پنچ کے خطوط بیٹے کے نام ہیں جو ڈگلس ولیم جیرلڈ نے لکھے تھے۔ پیش نظر خط میں باعزت پیشوں کی بے قدری پر طنز کیا گیا ہے مگر لطافت کے ساتھ۔

جنتری 1873ء: یہ سب سے جدا کتاب ہے جس میں کہنے کو جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر جو ایک سو چالیس سال پرانے برصغیر کے انداز فکر کی تشویشناک نقشہ کشی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ جنتری دیکھے بغیر گھر سے قدم نہیں نکالتے تھے۔ سفر پر جانا ہو، ملازمت کی تلاش پر جانا ہو، حاکم سے ملاقات ہو، نیا کاروبار شروع کرنا ہو، نئے گھر میں اترنا ہو، مویشی فروخت کرنا ہو، لڑکے کو مکتب میں بٹھانا ہو یا غسل صحت کرنا ہو، جنتری کی رائے لینا ضروری تھا۔ مطبع کوہ نور، لاہور میں یہ جنتری سید جواد علی شاہ پرنٹر نے چھاپی تھی۔ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مثلاً کوا بولے تو کب نحس ہے اور کب مبارک اور یہ کہ کوے کی آوازیں سولہ طرح کی ہوتی ہیں: کوائی کوائی، کیں کیں، کروں کروں، کویں کویں، گیں گیں، کریں کریں، ٹلکو ٹلکو، کیک کیک کروں کروں، کواس کروم، کرو کرو کواک کیو، کواں کواں کلرو کواں، سب لکھا ہے، ایک ہمارا جانا پہچانا کائیں کائیں ہی نہیں لکھا۔ کیسی نحس جنتری ہے۔

ٹھگ بدیا۔ مصطلحات ٹھگی: (1839ء) اب بھلا کسے یاد ہوگا کہ 1830ء اور 1840ء کے دوران برصغیر کے بڑے علاقے میں ٹھگ دندناتے پھرتے تھے۔ وہ لوگوں کو ٹھگنے سے پہلے انہیں قتل کرتے تھے۔ آخر انگریزوں نے ان کا صفایا کرنے کی ٹھانی اور ان دس برسوں میں تین ہزار سے زیادہ ٹھگ پکڑے گئے۔ انہیں جیل ویل نہیں ہوتی تھی، سیدھا پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ جیسے وہ دوسروں کو مارتے تھے، آپ بھی ایسے ہی مرے۔ اس کے بعد منشی مرزا محمد علی اکبر الٰہ آبادی نے دو سو صفحوں کی کتاب مصطلحات ٹھگی لکھی جس میں ٹھگوں کی اپنی خفیہ زبان رماسی کے ایک ہزار چھ سو سے زیادہ لفظ اور ان کے معنی جمع کیے گئے۔ اسی دوران دلّی کے بابو ساتول داس نے ٹھگ بدیا لکھی جس میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ لوگ ٹھگ کیونکر بنتے تھے اور اس کا طریقہ واردات کیا ہوتا تھا۔ مصطلحات ٹھگی کو نامور محقق رشید حسن خاں مرحوم نے تدوین کے بعد از سر نو شائع کیا ہے۔

تجربات ہند: (1897ء) تقریباً ایک سو بارہ سال پہلے چوری چکاری، دھوکا دہی،

عیاری اور دغابازی کے ہتھکنڈوں کے بارے میں یہ کتاب ریلوے پولیس پنجاب کے ایک سکھ سارجنٹ سردار بشن سنگھ سندھاں والیہ نے لکھی تھی۔ آنند پرکاش پریس امرتسر میں چھپنے والی اس کتاب کی قیمت سوا روپیہ تھی اور مقصد یہ تھا کہ عام لوگ اور پولیس والے اسے پڑھیں اور جرائم پیشہ لوگوں سے بچ کر رہیں۔ بیچارے مصنف کی اردو کمزور تھی۔ مثلاً قیافہ شناسی کو ہر جگہ کیافہ شناسی لکھا ہے اور یہی حال باقی عبارت کا ہے مگر سردار جی کو اپنی بات کہنے سے غرض تھی، سو انہوں نے کہہ دی۔

سیرِ پرند: (1897ء) تقریباً 115 سال پہلے یہ کتاب سیالکوٹ کے ملک قطب الدین نے لکھی تھی۔ پنجاب کے پرندوں اور شکار کے طور طریقوں پر ایسی کتاب پھر کبھی نہیں لکھی گئی ہوگی۔ تقریباً 470 صفحوں کی اس کتاب میں ملک صاحب نے شکار کھیلنے کے اپنے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ لکھا اور یہ کہہ کر لکھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ یہ تمام معلومات ان کے سینے میں پوشیدہ رہ جائیں۔ کتاب میں پنجاب میں رہنے والے اور وہاں سے گزرنے والے ایک ایک پرندے کی نہ صرف تفصیل لکھی ہے بلکہ برکت علی خوش نویس نے ان کی نہایت عمدہ تصویریں بھی بنائی ہیں۔ ملک قطب الدین 1857ء کی بغاوت میں سرکاری فوج کے رسالہ نمبر 5 میں جمعدار تھے اور اودھ کی 14 لڑائیوں میں شریک تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ لڑائی اور شکار کے داؤ پیچ بہت ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ فوجی ملازموں کو شطرنج بازی وغیرہ کے بجائے شکار کا شوق رکھنا چاہیے۔

کیسے کیسے لوگ تھے اور کیسے کیسے کام کر گئے۔ کہتے ہیں کہ جنہیں وقت نے بھلا دیا، ہمیں چاہیے کہ ہم بھی بھلا دیں اور آگے کی طرف دیکھیں۔ یہ معاملہ بحث طلب ہے۔

پروگرام کتب خانہ میں پڑھی جانے والی نثر کی کتابوں کا احوال یہاں مکمل ہوا۔ وقت اور قدرت نے مہلت دی تو ان کو مکمل کتاب کی شکل دی جائے گی جو پڑھنے کے قابل ہوگی۔

اب لندن کے کتب خانوں میں محفوظ اپنے بزرگوں کی شاعری کے تبرکات نکالیں گے۔ ان کی گرد جھاڑیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ زر و جواہر کے کیسے ذخیرے چھوڑ گئے۔

سحر البیان: (1803ء) اردو ادب کی اس شاہکار مثنوی کے ڈنکے بج رہے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اسے کلکتے کے اپنے چھاپے خانے میں طبع کرایا اور نہایت دلکش قرینے سے آراستہ ایک نسخہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے لیے خاص طور پر لندن بھیجا گیا جو یہاں آج تک محفوظ ہے۔ یہ وہی مثالی نظم ہے جسے لے کر میر حسن نواب آصف الدولہ کے حضور پیش ہوئے۔ آصف الدولہ تو طرزِ مرصع کے فارسی زدہ مترجم کو مالا مال کر چکے تھے۔ میر حسن کی مثنوی پر تو

خزانے لٹا دیے لیکن ہمارے شاعر کو اپنا دوشالہ دے کر چلتا کیا۔ انگریزوں نے اس کی قدر کی اور اپنے سفید فام افسروں کو اس کی مدد سے ہماری زبان سکھائی۔ شہزادہ بے نظیر بارہ برس کے ہوئے تو دنیا نے انہیں اور ان کے حسن کو دیکھا۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے شہزادی بدرِ منیر اپنی خواصوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر گئی اور یکا یک بے نظیر کو دیکھا:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن　　مرادوں کی راتیں جوانی کے دن
وے عشق کی تیغ کھائے ہوئے　　کھڑا دل کسی پہ لگائے ہوئے
یہ دیکھا جو عالم تو غش کر گئیں　　وہ جتنی کہ آئیں تھیں سب مر گئیں

یہ مصرعے سوچ کر نہیں لکھے جاتے۔ کہیں سے اُترتے ہیں۔

ناسخ، مومن اور میر: ان عظیم اساتذہ کا کلام جدید چھاپے خانے سے جس شکل میں نکلا، یہاں اسی کا احوال ہے کہ یہ ساری کلیات لندن میں بحفاظت محفوظ ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کا کلام 1845ء میں لکھنؤ کے مطبع سولائی میں شہزادہ مرزا فرخندہ بخت کی فرمائش پر داروغہ مومن علی کے زیرِ اہتمام چھاپا گیا۔ بے مثال نسخہ ہے۔

کلیاتِ مومن کا یہ صاف ستھرا، عمدہ چھپا ہوا نسخہ 1867ء میں منشی نولکشور نے شائع کیا تھا اور محمد مقصود خوش نویس نے اس کے ساڑھے چار سو صفحوں پر موتی ٹانکے تھے۔ اس بات کو اب ڈیڑھ سو سال ہونے کو آرہے ہیں۔

ایک ہزار اٹھاون صفحوں کی کلیاتِ میر تو ایسی ہے کہ دیکھا ہی کیجیے۔ اردو چھاپہ خانہ قائم ہوئے بمشکل بارہ سال گزرے تھے کہ فورٹ ولیم کالج نے کمر باندھی اور اتنی بڑی اور ضخیم کتاب چھاپ ڈالی۔ بڑی تقطیع پر اس زبان کے پیچیدہ ٹائپ کو کمپوز کرنا، صفحات چھاپنا، انہیں ترتیب سے محفوظ رکھنا اور پھر ان کی جلد بندی کرنا، یہ سب کچھ 1811ء میں آسان نہ تھا۔ کتاب کی نگرانی کا فرض مرزا کاظم علی جواں، مرزا جان طپش، مولوی محمد اسلم، تارنی چرن متر اور منشی غلام اکبر کو سونپا گیا۔ یہ کلیات کپتان ٹیلر کی ہدایت پر اور ولیم ہنٹر، کپتان گالوے اور کپتان ٹامس روبک کے تعاون سے چھپی۔ میر نے چند لوگوں سے عشق کیا ہوگا، میر سے جن لوگوں نے عشق کیا، ان کا کوئی شمار ہے؟

مثنوی سراپا سوز: (1827ء) ایک گمنام مثنوی جواب سے تقریباً ایک سو اسی سال پہلے قاضی محمد صادق خاں اختر نے لکھی تھی۔ وہ ناسخ کے دوست تھے اور اپنی یہ مثنوی ناسخ کو سنائی تھی جس پر انہوں نے تاریخ بھی کہی تھی۔ یہ ایک مسلمان امیر زادے اور ہندو سنار کی بیٹی کی عشق

کی داستان ہے جو بالآخر اپنے عشق کی آگ میں جل جاتے ہیں۔

قصۂ شاہ روم: (1847ء) کسی گمنام شاعر کی یہ منظوم داستان اتنی مقبول ہوئی کہ دس پندرہ برسوں میں تیس مرتبہ چھاپی گئی۔ بعض ناشروں نے اسے ہندی اور گجراتی رسم الخط میں بھی چھاپا۔ شعر کمزور تھے مگر بیان کا ڈھنگ غیر معمولی طور پر دلچسپ تھا۔ وہی جادوئی کہانی ہے جو معجزوں پر ختم ہوتی ہے۔ اب ناپید ہے۔

قصۂ سپاہی زادہ: (1847ء) دلّی کے کوئی شاعر تھے جن کا تخلص خوش دل تھا۔ ان کے اس قصے کا جو سب سے پرانا ایڈیشن محفوظ ہے، وہ ایک سو ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ ہوا لکھنؤ میں چھپا تھا۔ برٹش لائبریری میں اس کے بیس ایڈیشن موجود ہیں جن میں کئی ہندی رسم الخط میں ہیں۔ سپاہی زادہ بے روزگار تھا۔ ایک جگہ نوکری ملی تو نوکری دینے والا بھی قلاش تھا۔ اس نے سپاہی زادے کو ایک بیل دے دیا جو ڈاکوؤں نے بے وقوف بنا کر ہتھیا لیا۔ سپاہی زادے نے بڑی چال چل کر ڈاکوؤں کے حواس ٹھکانے لگائے اور اپنا بیل واپس لے لیا۔ بہت مہذب قصہ ہے اور زبان سادہ اور سلیس ہے۔

جواہر منظوم: (1849ء) غالبیات کے ماہر کہتے ہیں کہ غالب کو انگریزی شاعری سے بھی یقیناً کوئی تعلق رہا ہے لیکن کب اور کیسے؟ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بی بی سی کے پروگرام کتب خانہ میں تحقیق کے دوران انگریزی شاعری کا وہ اردو ترجمہ مل گیا جس کا غالب نے نہ صرف مطالعہ کیا ہوگا بلکہ اس کو درست بھی کیا ہوگا۔ تقریباً ایک سو ساٹھ سال پہلے الٰہ آباد میں محکمہ تعلیم کے ایک سابق ملازم منشی غلام مولا نے ولایت کی کتاب Selections of English Poetry حصہ اول کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو اصلاح کے لیے مرزا غالب کو بھیجا گیا تھا۔ کتاب میں ساری نظمیں بچپن کے موضوع پر ہیں۔ ان میں سے ایک نظم کا تلوک چند محروم نے بھی ترجمہ کیا تھا مگر اس میں وہ بات نہیں۔ دل پر اثر کرنے والا کلام ہے۔

لوری نامہ: (1874ء) کتنے لوگوں نے سوچا ہوگا کہ مائیں جو لوریاں گا کر بچوں کو سلاتی ہیں، انہیں کتاب کی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ کام مدراس کے انگریز سرجن جنرل ایڈورڈ بالفور نے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے کیا تھا اور 34 صفحوں کی کتاب لوری نامہ ترتیب دی تھی جس میں اٹھارہ لوریاں جمع ہیں جو غالباً جنوبی ہند میں رائج ہوں گی۔ بعض کے شاعروں کے نام بھی درج ہیں۔ مثلاً احمدی منشی، مشتری اور مخدوم۔ پروگرام میں نہ صرف منتخب

لوریاں بلکہ ایڈورڈ بالفور کے زندگی کے دلچسپ واقعات بھی شامل تھے۔

مثنوی حبیب:(1844ء) تقریباً170 سال پہلے یہ مثنوی محمد عباس مبارز علی خاں کی فرمائش پر اور سید وصف علی کے بیان کیے ہوئے قصے کی بنیاد پر حبیب نامی شاعر نے لکھی تھی۔ شاعروں کو شعر کہنے کا ہنر تو خوب آتا ہے مگر قصہ کہنے میں نرے کورے تھے۔ وہی شدید عشق ہونا اور آخر میں دونوں کا مر جانا، پڑھنے والا آٹھ دس مثنویاں مسلسل پڑھ لے تو اپنا سر پیٹ لے۔ بہر حال مثنوی حبیب میں بھی مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی کے عشق اور آخر میں دونوں کے جل جانے کا قصہ ہے۔

مثنوی داغ دل:(1846ء) یہ مثنوی کشمیر کے پنڈت دیا ناتھ وفا نے لکھی تھی اور لکھنؤ کے مطبع محمدی میں چھپی تھی۔ ہے تو وہی عشق اور اس کے انجام کا قصہ مگر زبان سادہ، انداز سہل اور اشعار دلکش ہیں۔

ہے یہی جذبِ الفتِ صادق کہ ہو معشوق، عاشقِ عاشق

مثنوی عابد:(1867ء) مقام شکر ہے کہ یہ مثنوی سب سے الگ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اسے الہ آباد کی عدالت دیوانی کے امین محمد عبداللہ خان نے انگریزی سے ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ اتنا عمدہ تھا کہ لیفٹیننٹ گورنر ولیم میور نے سنا تو ایک سو روپیہ انعام دیا اور اسے الہ آباد کے سرکاری چھاپے خانے میں چھاپنے کا حکم دیا۔ اس بات کو 140 سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ مثنوی عابد آئرلینڈ کے شاعر ٹامس پارنل کی طویل نظم Hermit کا منظوم ترجمہ ہے۔ حقیقتاً پڑھنے کے قابل ہے۔

گلزار نسیم:(1848ء) اگر زبانوں کو اپنے شاہکاروں پر ناز ہوتا ہے تو اردو کو سحر البیان اور گلزار نسیم پر بجا طور پر ناز ہوگا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی یہ مثنوی کہنے کو ایک شہزادے اور ایک پری کی داستان ہے جس کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر اس کا ایک ایک نقطہ اردو کی اوڑھنی میں ستاروں کی طرح ٹانکا گیا ہے۔ لندن میں گلزار نسیم کا جو نسخہ محفوظ ہے، وہ ایک سو ساٹھ سال سے زیادہ ہوئے لکھنؤ کے محمد مصطفیٰ خاں نے اپنے مطبع مصطفائی میں چھاپا تھا۔ 45 صفحوں کی یہ مثنوی بہت آن بان سے چھاپی گئی تھی۔ اسے کسی بہت اچھے خطاط سے لکھوایا گیا تھا۔ کتاب کی غلطیاں برائے نام ہیں اور ایسے دبیز کاغذ پر چھپی ہے کہ لگتا ہے ابھی پچھلے برس چھپی ہے۔ قصہ وہی ہے کہ شہزادہ تاج الملوک پیدا ہوا تو نجومیوں نے اس کے باپ سلطان زین الملوک کو خبردار کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی صورت نہ دیکھے ورنہ اندھا ہو جائے گا مگر ہوا یہ کہ ایک روز ان کا آمنا سامنا ہو گیا اور باپ کی بینائی

جاتی رہی۔ طبیبوں نے بتایا کہ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ بکاؤلی پری کے محل کے حوض میں جو پھول تیر رہا ہے، وہ لاکر بادشاہ کی آنکھوں سے لگایا جائے۔ اس پر بادشاہ کے چار بڑے بیٹے خم ٹھونک کر نکلے اور اِدھر اُدھر اپنے احمق پن کے مظاہرے کرتے رہے۔ اِدھر تاج الملوک بھی خاموشی سے نکل کھڑا ہوا اور پھر جو عشق کی داستان رقم ہوئی، جس نے نہیں پڑھی، جذبۂ عشق سے بے بہرہ ہے۔

چوہے نامہ۔ بلی نامہ: (1877ء۔ 1847ء) بلی نامہ ارم نے فارسی سے ترجمہ کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں شاہی حکومت کا نیا نیا چھاپہ خانہ لگا تھا جہاں بڑی خوبصورت کتابت کے ساتھ دبیز کاغذ پر چھاپا گیا اور جا بجا تصویریں بنائی گئیں۔ بظاہر یہ ایک بلی اور بہت سے چوہوں کی داستان ہے لیکن سچ پوچھیے تو اس کا ہر کردار ہمارے معاشرے کے کسی نہ کسی کردار کا عکس ہے۔ یہ کتاب بار بار چھپی اور گھر گھر پڑھی گئی۔ اس کے اردو ہندی اور گجراتی میں آٹھ ایڈیشن ملتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد چوہے نامہ شائع ہوئی۔ صرف چار صفحوں کی اس کتاب کے مصنف واجد نام کے کوئی شاعر تھے۔ اس میں بھی معاشرے کے کئی کردار چوہوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ انداز ہو بہو نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ ریڈیو کے اسی پروگرام میں ہم نے نظیر کی نظم "آ چار چوہوں کا" بھی پڑھ کر سنائی تھی۔ سنا ہے یہ نظم ان کے ابتدائی دنوں کی ہے اور کلیات میں شامل نہیں۔

شریعت کا لٹھ اور دوسرے کتابچے: (1880ء۔ 1850ء) انیسویں صدی کے کتابوں کے ذخیرے میں چار چار آٹھ آٹھ صفحوں کی بہت سی کتابیں نظر آتی ہیں۔ ان سب کا تعلق یا تو مذہب سے ہے یا اخلاق سے مثلاً شریعت کا لٹھ، نصیحت نامہ، نورنامہ، الف بائے کریم اور رسالۂ بے نمازاں۔ یہ کوئی اعلیٰ ادب نہیں مگر ایک مخصوص دور کے معاشرے کی دلچسپ تصویر ضرور ہے۔ اس پروگرام میں ان سب کے اقتباس سنائے گئے ہیں۔

دیوانِ شور: (1864ء) اپنی شعر گوئی کی تاریخ میں ہمیں تقریباً ایک سو فرنگی شاعرات اور شاعر ملتے ہیں۔ زیرِ نظر دیوان جارج پیش شور کا ہے جن کے باپ فرانسیسی اور ماں جرمن تھیں اور وہ خود علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے نانا فراسو بیگم سمرو کے درباری شاعر تھے۔ جارج پیش شور نے اپنے چھ دیوان مرتب کیے۔ لندن میں ان کے پہلے دو دیوان محفوظ ہیں۔ دو سو بیس صفحوں کے اس پہلے دیوان میں ان کی سیکڑوں غزلوں، بہت سے مخمسوں، رباعیوں، مرثیوں، تاریخوں اور قصیدوں کے علاوہ مس ایلس اور مسٹر کانر کی شادی کا سہرہ بھی شامل ہے۔

کر کے خوں خشک یہ اشعار کیے ہیں پیدا　　　تا کہ اے شور مرے بعد یہ اولاد رہے

قصہ محمود شاہ: (1868ء) ایک سو چالیس سال سے زیادہ ہوئے منظوم قصوں کی یہ کتاب شائع ہوئی جسے منشی نولکشور نے شائع کیا تھا۔ اس میں چار قصے اور آٹھ نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب اس وقت کے ذوق پر پوری اترتی تھی، اس لیے بار بار چھاپی گئی۔ قصہ محمود شاہ میں قاضی اور کوتوال کا قصہ ہے۔ جس کا مطالعہ یوں دلچسپ ہے کہ ان دنوں کے اور آج کے قاضی اور کوتوال میں بلا کا فرق نظر آتا ہے۔

زہرِ عشق: (1867ء) سچی بات ہے کہ اس مثنوی پر اردو شاعری کی یہ صنف ختم ہے۔ لکھنؤ کے حکیم نواب مرزا شوق نے اس کتاب میں اپنی چار مثنویاں جمع کی ہیں: بہارِ عشق، زہرِ عشق، لذتِ عشق اور فریبِ عشق مگر باقی تین مثنویاں زہرِ عشق کی خاک کو بھی نہیں پہنچتیں۔ جب دوسرے شاعر انجانے نگر کے شہزادوں اور پہاڑوں کے اس پار رہنے والی پریوں کی محبتوں کی داستانیں رقم کر رہے تھے، مرزا شوق نے شہر ہی کے ایک محلے میں رہنے والے نوجوان اور کچھ مکان چھوڑ کر اسی محلے میں رہنے والے ایک سوداگر کی بیٹی کے عشق کا قصہ اس طرح لکھا کہ لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو حکم دے دیا کہ یہ کتاب نہ پڑھیں لیکن خوب خوب حکم عدولی ہوئی اور کہنے والے کہتے ہیں کہ اسے پڑھ کر آٹھ نو لڑکے لڑکیوں نے زہر پی کر جان دی۔ زہرِ عشق کا جو سب سے پرانا ایڈیشن لندن میں محفوظ ہے، اب سے تقریباً 145 سال پہلے نولکشور کے چھاپے خانے نے شائع کیا تھا۔ کتاب میں شاعر نے اپنے جذبات جس طرح کھول کر بیان کیے تھے، مصور نے بھی اسی طرح ان کے جذبات کو تصویروں میں ڈھال دیا۔ کتاب چھپی تو ایک کہرام مچ گیا۔ کسی نے کہا کہ یہ دلکش شاعری کی معراج ہے۔ کسی نے حکم دیا کہ خبردار یہ کتاب شریف گھرانوں میں داخل نہ ہونے پائے۔

آج بھی حال یہ ہے کہ کسی ناشر کو اصل ایڈیشن کا عکس چھاپنے کی جرأت نہیں۔ حالانکہ وقت اور زمانہ بس اب برہنہ ہوا ہی چاہتا ہے۔

قصہ گوپی چند: (1868ء) یہ وہ زمانہ تھا جب بعض مسلمان یہ سمجھ کر کہ اس طرح دین کو فروغ ہوگا، معجزوں اور کرامات کے قصے لکھ لکھ کر چھاپ رہے تھے۔ ہندو بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ایک سو چالیس سال ہوئے دہلی کے لالہ انبے پرشاد مدہوش نے بھی یہ منظوم قصہ لکھا جس میں مردے کے زندہ ہو جانے کی داستان ہے۔ دہلی کے ہندو پریس میں چھپنے والی اس کتاب پر بھی مسلمانوں کی کرامات کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ لالہ جی کی نظم کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے اور مردے کو زندہ کرنے کے لیے:-

گورو نے کہا قُم باذن خدا

اور پھر کتاب کا خاتمہ یوں ہوتا ہے۔ الٰہی ہو مقبول ہر خاص و عام

لالا نے پرشاد مدہوش کی یہ دعا قبول ہوئی۔ لندن میں اس کتاب کے چھ ایڈیشن محفوظ ہیں۔

ذکر السعدین: (1875ء) امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے تعلق سے منشی مہدی حسن خاں کی تیس صفحوں کی یہ کتاب 135 سال پہلے پٹنہ میں چھپی تھی۔ اس پروگرام میں واقعہ کربلا سے متعلق ان تمام کتابوں کا ذکر تھا جو لندن میں محفوظ ہیں۔ کم سے کم تین کتابیں اگرچہ اردو زبان میں ہیں مگر ان کا رسم الخط گجراتی اور عربی ہے کیونکہ ان علاقوں میں عزادار اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتے تھے۔ محمد فاضل کی کتاب جنگ نامۂ کربلا بار بار چھپی۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

دیوانِ فنا: (1876ء) جوزف جیسلے فنا اردو کا خوبصورت، خوب سیرت اور تنومند نوجوان شاعر تھا۔ ہر شخص اس کی خوبیوں کا دم بھرتا تھا۔ الور کے دربار میں اس نے اپنے لیے اونچا مقام بنالیا تھا مگر تپ دق نے اسے آن دبوچا اور صرف 24 سال کی عمر میں چل بسا۔ اپنے پیچھے اس نے صرف ایک دیوان چھوڑا جو آج سے 135 سال پہلے میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ خیال ہے الور کے شاہی خانوادے میں کسی سے ایسا عشق ہوا جو اس کی جان لے کر گیا۔

دین و دل تو دے چکے تھے جان بھی اس بت کو دی　　　اے فنا افسوس تم نے عشق میں یہ کیا کیا

پیری نامہ۔ عبرت نامہ: (1877ء) بڑھاپے کا دکھڑا اور دنیا کی بے ثباتی کا شکوہ، یہ دو طویل نظمیں منشی مرزا محمد رضا معجز نے لکھی تھیں اور اب سے 133 سال پہلے کانپور میں بڑے سلیقے اور اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں نظیر اکبرآبادی کا آدمی نامہ اور بنجارہ نامہ دھوم مچا رہے تھے۔ یہ ہیں معجز کی دونوں نظموں کے چند مصرعے:

لاریب ہے شباب تلک لطف زندگی　　　جو شکل اب ہماری ہے، ایسی کبھی نہ تھی
کس سے کہیں یہ حال، جوانی تو چل بسی　　　کرتا نہ وہ عدو، جو بڑھاپے نے ہم سے کی
یارب برا ہو پیریٔ خانہ خراب کا　　　محتاج بال بال ہوا ہے خضاب کا

نہیں معلوم کیا پتھر پڑے ہیں عقل پر تیری　　　خرابی میں تجھے ڈالے گی الفت مال دنیا کی
جو دانا ہے، گرہ میں باندھ رکھ اس بات کو میری　　　نہ دولت کام آئے گی نہ تیرے ساتھ جائے گی
مہیا گرچہ سب اسباب ملکی اور مالی تھے　　　سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

مجموعۂ خیال۔قصہ جانی بیگم۔پہیلی نامہ: (1833ء۔1879ء) یہ تین کتابیں اب تین عجوبے معلوم ہوتے ہیں۔"مجموعہ خیال" میں صوفیانہ کلام ہے جو شاید جوگی بیراگی گاتے ہوں گے۔ یہ کلام فقیر محمد تیغ، غلام حسین ظریف، عبداللہ خان خنجر، محمد علی میر اور کاشی گر بنارسی کا کہا ہوا ہے۔ اس میں تصوف کا رنگ اور معرفت کے راز چھپے ہیں۔ خدا جانے یہ لوگ کون تھے۔ کیا کرتے تھے؟ "قصہ جانی بیگم" دکنی اردو میں ہے اور "مجموعۂ خیال" کی طرح بمبئی میں چھپا تھا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ 28 صفحوں کی اس منظوم کتاب میں اتنے طویل مصرعے ہیں کہ ریڈیو پر ایک مصرعہ پڑھنے میں آٹھ منٹ صرف ہوئے تھے۔ پوری کتاب میں صرف دس مصرعے ہیں اور کہیں کہیں بے حجابانہ بھی ہیں۔ تیسری کتاب "پہیلی نامہ" ہے جسے الطاف رسول نے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب 1873ء میں دہلی میں چھپی۔ اس میں امیر خسرو کے علاوہ بہادر شاہ ظفر، حکیم آغا جان عیش، حکیم تجمل رسول خاں تجمل اور دوسرے شاعروں کی کہی ہوئی پہیلیاں بھی جمع کی گئی ہیں۔ دلچسپ کام ہے۔

گلدستۂ بیت بازی: (1876ء) سولہ صفحوں کی یہ دلچسپ کتاب میر غیاث الدین غیاث نے لکھی تھی۔ اس بات کو اب 135 سال ہو رہے ہیں۔ اس میں مکمل بیت بازی ہے اور الف سے یے تک سیکڑوں شعر شامل ہیں۔ خود غیاث کی کہی ہوئی غزلیں ہیں۔ پہلی غزل کے سارے مصرعے آ سے شروع ہو کر آ ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ دوسری میں مصرعے آ سے شروع ہو کر الف پر۔ تیسری میں الف سے شروع ہو کر بے پر، چوتھی میں بے سے شروع ہو کر پ پر ختم ہوتے۔ راہ میں ٹ، ڈ، اور ڑ تک آتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ یے تک جاتا ہے۔

مثنوی خواب مرزا: (1874ء) یورپ کے فکشن کا تو اردو ادب پر گہرا اثر ہوا لیکن انگریزی زبان کی لاجواب شاعری سے اردو والوں نے ذرا فاصلہ رکھا۔ ایسے میں ضلع مراد آباد کے منوں لال رفعت نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور انگریزی کے مشہور شاعر ایڈیسن کی نظم فرسٹ وژن آف مرزا کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ بہت بڑی نظم ہے جس کا مرکزی کردار مرزا بغداد کا باشندہ ہے جسے بغداد کا جن پہاڑی کی چوٹی پر لے جاتا ہے۔ جہاں سے اسے انسانی زندگی کے سارے منظر نظر آتے ہیں۔ آخر میں وضاحت ہوتی ہے کہ گھاٹیاں، پل، جزیرے، الماس کے پہاڑ، سیاہی، تلواریں، بلبلے زندگی کے کن مرحلوں اور مدارج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کتاب کو شائع ہوئے اب ایک سو چالیس برس ہونے کو ہیں۔

قصۂ عجمہ شاہ: (1873ء) ہوا یہ کہ دکن کے حسن المعنی نے حضرت عیسیٰ کے تعلق سے

جم جمہ بادشاہ کا قصہ نظم بند کیا جو خالص دکنی میں تھا۔ اسے شمالی ہند میں پسند تو کیا گیا مگر اسے سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ اس پر منشی احمد علی شیوراج پوری نے یہی نظم آسان اردو میں لکھی جسے لکھنؤ کے مطبع گلزار محمدی نے شائع کیا۔ اسے قصہ جمجمہ شاہ کا نام دیا گیا۔ یہ شام کے ایک بادشاہ کا قصہ ہے جس کی کھوپڑی حضرت عیسیٰؑ کو ملی اور جس نے اپنے گمراہ ہونے اور مرنے کا سارا احوال بیان کیا۔ پیغمبر کی دعا سے وہ دوبارہ زندہ ہوا اور نیکی کی راہ اختیار کی۔ ایک سو چالیس سال پہلے ایسے ہی قصے اور ایسی ہی کہانیاں پسند کی جارہی ہوں گی۔

قصہ کالی گوری۔ راحت طفلی: (1873ء۔1876ء) قصہ کالی گوری ٹھیٹھ دکنی میں لکھی گئی ہے اور اسے مدراس کے ایک چھاپے خانے نے شائع کیا تھا۔ عوامی نظم ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نے کہی تھی۔ اس میں ایک گوری عورت سیاہ فاموں میں سو عیب نکالتی ہے۔ اس کے بعد کالی عورت اسے قائل کرتی ہے جس کے بعد دونوں بہنوں کی طرح مل جل کر رہنے لگتی ہیں۔

راحت طفلی طویل اور معیاری نظم ہے جو نامور شاعر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے لکھی تھی اور تقریباً 135 سال پہلے لکھنؤ کے مطبع گلزار محمدی نے چھاپی تھی۔ بچپن اور لڑکپن کے سکھ اور آرام کا نہایت پر اثر بیان ہے۔ کیوں نہ ہو، صفیر مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

مثنوی سعدین: (1871ء) اس کہانی کے شاعر انوار حسین تسلیم منشی نولکشور کے چھاپے خانے میں کام کرتے تھے اور ایک دوست کی فرمائش پر یہ مثنوی دس روز میں مکمل کی تھی۔ قصے میں ایک نوجوان شاعر اور پڑوسی کی بیٹی کے عشق کی داستان ہے جس میں ایسے مقام بھی آتے ہیں کہ گھر کی عورتوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی لیکن خلاف معمول اس کے آخر میں جنازہ نہیں اٹھتا بلکہ دلہن کی ڈولی اٹھتی ہے۔ لکھنؤ میں شادی کی رسموں کا بیان اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ہے۔ اس میں اس دور کی لکھنؤ کی مشہور رقاصہ مشتری کا ذکر بھی ہے جسے شاید لکھنؤ والے اب تک بھول چکے ہوں گے۔

پرکالہ آتش: (1870ء) یہ بھی وہی پہلے عشق اور آخر میں موت کی مثنوی ہے لیکن اس کی دو باتیں دلچسپ ہیں۔ اول یہ کہ یہ واقعہ فرضی نہیں حقیقی ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے مصنف منشی طوطا رام شایاں باکمال شاعر تھے اور قصوں کو نظم کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لندن میں ان کی آٹھ تصانیف موجود ہیں۔ الف لیلہ منظوم، مہابھارت منظوم، دریائے حسن، فرہنگ عشق، ہزار داستان، طلسم شایاں اور نیرین ہند۔ یہ پرکالہ آتش آج سے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے مطبع

خاص، ثمر ہند، لکھنؤ میں چھپی تھی۔

غزل ہی غزل: اب تک چند مثنویوں کی بات ہوئی جن کا شمار مشکل نہیں۔ اب باری ہے غزل کی اور دیوانوں کی جنہیں گننا مشکل ہے۔ اس پروگرام میں چار دیوان پڑھے گئے۔

نواب مرزا جاہ والا عاشق کا فیض نشان: 1873ء میں لکھنؤ کے مطبع مصطفائی نے چھاپا۔

مجھ کو وہ غیر، غیر کو اپنا سمجھ گیا ۔۔۔ اچھا نہیں برے کو جو اچھا سمجھ گیا

کشن کمار وقار کا بہارستانِ اشعار وہی 1873ء کے قریب چھپا جس کا دیباچہ خود منشی نولکشور نے لکھا۔

دیکھ کر آئینے میں ابرو، وہ بسمل ہو گیا ۔۔۔ یہ تماشا ہے نیا، مقتول قاتل ہو گیا

محمد وزیر خاں وزیر شہر میرٹھ کے کوتوال تھے۔ ان کے 1874ء کے دیوان وزیر کا ہر شعر ان کے کوتوال ہونے کی چغلی کھا رہا ہے۔

رات محفل میں تو ہم دوش رہا غیروں سے ۔۔۔ دل میں کچھ اور ہی آئی تھی مگر چھوڑ دیا

سندیلہ کے رئیس سید فضل رسول خاں واسطی کا دیوان 140 سال پہلے لکھنؤ سے شائع ہوا اور دیوان واسطی کہلایا اور آخر میں سہارنپور کے سید غلام عباس کا دیوان عباس جو 1870ء میں سہارنپور سے چھپا۔ وہ منشی بال مکند بے صبر کے شاگرد تھے۔

چار دیوان، ایک موضوع: اس پروگرام میں چار دیوان پڑھے گئے۔ چاروں میں تصوف اور معرفت کی باتیں تھیں۔ اول سید شاہ محمد افتخار علی مدنی، چشتی، قادری الحسنی والحسینی کا دیوان وطن۔

میں نہ بندہ نہ خدا تھا، مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔ دونوں علت سے جدا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

مولوی ضامن علی جلال آبادی چشتی صابری کا دیوان ضامن عرف گلدستہ معرفت 1870ء میں دہلی میں چھپا تھا۔

عاشق کسی پری کے نہ ہم دل ربا کے ہیں ۔۔۔ ہم کو قسم خدا کی ہے، طالب خدا کے ہیں

بریلی کے محمد لطف علی خاں لطف کا دیوان لطف بنگلور کے مطبع فردوسی سے شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔

نیک نامی اسے عقبیٰ میں میسر ہوگی ۔۔۔ ہے جو دنیا میں ترے عشق سے رسوا محبوب

مظفر نگر کے نتھا سنگھ طالب فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ ان کا دیوانِ طالب 1881ء

میں شائع ہوا۔

جدا خدا سے ہیں جائیں گے مل، کریں گے پستی سے اوج حاصل
یہ نقطہ نیچے جو لگ رہا ہے، اب اس کو اوپر لگائیں گے ہم

نعتِ سروری، دیوانِ شیریں اور دیوان چندا: تاریخ مخزن پنجاب کے مصنف مفتی غلام سرور کا دیوان "نعتِ سروری"۔ لاہور کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 1873ء میں شائع ہوا۔ بھوپال کی نواب شاہجہاں بیگم شیریں کا دیوان شیریں 1871ء میں کانپور کے مطبع نظامی نے بڑی آن بان سے شائع کیا تھا جس میں غزلوں کے علاوہ ان کی کہی ہوئی ہولیاں، دادرے، سہرے اور سمدھن پر ہونے والی لعن طعن بھی شامل ہے اور آخر میں دکن کی ماہ لقا چندا کا دیوان جسے کہتے ہیں اردو میں کسی خاتون کا پہلا دیوان تھا۔ اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے جو انہوں نے 18 اکتوبر 1799ء کو ایک مجرے کے دوران کیپٹن سرجان مالکم کو پیش کیا تھا۔

سخنِ شعراء: (1875ء) اردو زبان میں ایک بڑا خسارہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں نے اپنے دور کے شاعروں کے تذکرے لکھنے چھوڑ دیے ہیں۔ جس زبان میں آزاد کی آبِ حیات اور عبدالغفور نساخ کی سخن شعراء جیسی کتابیں لکھی گئی ہوں اس میں تذکرے لکھنے کی رسم اٹھ جانا باعثِ حیرت ہے۔ لوگ سرکردہ شاعروں کا احوال تو لکھتے ہیں، جیسا کہ آزاد نے کیا لیکن گمنام شاعروں کو بھول جانے کی روایت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ بی بی سی اردو سروس کے پروگرام کتب خانہ میں ہم نے ان شاعروں کا ذکر چھیڑا جو تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تھے اور پھر نہ وہ خود رہے اور نہ ان کا تذکرہ۔ چند مثالیں یہاں درج ہیں: مرزا احسن علی احسن، خوش نویس تھے۔

بزم میں اس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی ۔۔۔ دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

صمصام الدین احمد۔ دہلی میں رہتے تھے اور سپاہی پیشہ تھے۔

فراقِ گل رخاں میں کھا کے داغ آہستہ آہستہ ۔۔۔ کیا سینے کو میں نے باغ آہستہ آہستہ

مرزا احمد بیگ احمد۔ دہلی میں رہتے تھے اور مشہور ہے کہ جنات ان کے قبضے میں تھے۔

ہوئے جو خاک اس کوچے میں تو یہ آبرو پائی ۔۔۔ لگے سو بار قدموں سے، لگے سو بار دامن سے

میر اکبر علی اختر۔ جرأت کے شاگرد تھے۔ آتش بازی بڑی مہارت سے بناتے تھے۔

بزم میں کس کی رات جاگے تم ۔۔۔ ہے جو اب تک خمار آنکھوں میں

قاضی محمد صادق اختر۔ ہوگلی کے باشندے تھے۔ فنِ شعبدہ میں کمال تھا۔ کہتے ہیں کیسا

بتاتے تھے۔

لطفِ بے حد سے ترے سب دشمنِ جاں ہو گئے ابرِ رحمت ہائے میرے حق میں طوفاں ہو گیا

پریم ناتھ رائے آرام۔ تیر اندازی اور خوش نویسی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔

خون آنکھ سے نکلتا ہی رہا دل کا فوارہ اچھلتا ہی رہا
کون دلداری کرے آرام کی ایک مجنوں تھا سو چلتا ہی رہا

گلاب سنگھ آشفتہ۔ دلّی کا باشندہ تھا۔ جو نامی ایک زنِ خانگی پر عاشق تھا۔ ایک روز گلا کاٹ کر مر گیا۔

پوچھتے کیا ہو کہ شب آشفتہ کیونکر مر گیا اس میں کیا باقی رہا تھا بندہ پرور، مر گیا

نور خاں افغان۔ آگاہ تخلص کرتے تھے اور قصہ گو تھے۔

حلقۂ چشم میں کیوں آج ہے دم پابہ رکاب ہے کہاں کا ہمیں در پیش سفر دیکھیں تو

امراؤ علی امراؤ اکبر آباد میں رہتے تھے۔ پڑھے لکھے بالکل نہ تھے مگر بے حد ذہین تھے۔ 70 برس جیے۔

دو پھول گر کسی نے چڑھائے، اڑا دیے بادِ صبا کو گورِ غریباں سے لاگ ہے

حسین بخش بخشی۔ کپڑا فروخت کرتے تھے۔

کھلتا ہوں جس سے میں وہ کولا لاعدیہ کہتا ہے مجھے بے حد ماں روز آتی ہیں گنتا ئیں گے

ہیرا۔ دہلی کا رہنے والا تھا۔ شعر خوب کہتا تھا مگر ان میں بھی سوقیانہ پن جھلکتا تھا:

شوقِ گریہ کو کہو روئیے کس پاس اب نام کو بھی نہ رہا آنکھ میں قطرہ باقی

آکا۔ دہلی کا قصاب تھا اور تنہا تخلص کرتا تھا۔

اب نامہ بر بتائیں گے تا صبح کو جی میں ہے معقول آدمی تو کوئی ہو جواب کو

میر حیدر علی دہلوی حیراں۔ بہار میں کسی نے انہیں قتل کیا۔ البتہ مرتے مرتے قاتل کو بھی مار ڈالا:

دیکھ زخمی مجھے اس کوچۂ قاتل والے ہنس کے کہتے ہیں کہ آ زخمِ جگر سلوا لے

تذکرۃ النساء: (1877ء) درگا پرشاد کے اس تذکرے اور دوسرے تذکروں میں بہت سی خواتین کے حوالے ملتے ہیں جو شعر کہتی تھیں۔ چند مثالیں یہ ہیں:

حسنی بیگم۔ دہلی کی کوئی پردہ نشین خاتون تھیں:

گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

بنّو۔ دہلی کی ایک عورت تھی۔ گلاب سنگھ آشفتہ اسی کے عشق میں اپنا گلا کاٹ کر مر گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد بنّو گوشۂ تنہائی میں چلی گئی اور تپِ دق میں مبتلا ہو کر مر گئی۔

نہ تو موت آتی ہے نہ زیست کا یارا مجھ کو ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھ کو

ہے غضب وہ تو مرے اور جیوں میں بنّو موت آ جائے تو ہو عمر دوبارا مجھ کو

پارسا۔ اسم با مسمّیٰ تھیں۔ نواب میرزا تقی خاں کی بیٹی تھیں۔ مرزا صاحب نے بیٹی کی شادی نہیں کی کہ سسرے کہلائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ کسی کو داماد بنانا باعثِ شرم سمجھتے تھے۔

تن صورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا یہ قصرِ لاجواب بنا اور بگڑ گیا

جمیعت۔ عیسائی خاتون تھیں۔ والدہ ہندوستانی اور باپ انگریز تھے۔ میجر آرجسٹن سے شادی ہوئی۔ موسیقی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ آگرے کے گویے ان کے شعر ذوق وشوق سے گاتے تھے:

خدا کے روبرو جانا، ندامت مجھ کو بھاری ہے کوئی نیکی نہ بن آئی اسی کی شرمساری ہے

بادشاہ بیگم خفی۔ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی نواسی تھی اور بلاک صاحب بہادر سے پیدا ہوئی۔ پیشہ مادری چھوڑ کر کسی انگریز سے منسوب ہوئی۔ فارسی خوانی اور خوش خطی میں صاحبِ ہنر تھی:

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

اے خفی اپنے اشکِ بے تاثیر مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

تو یوں پروگرام کتب خانہ 75ء سے 77ء تک نشر ہوتا رہا اور اس دوران ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہوئی۔ ایک تو یہ کہ تحقیق کرنے والوں کو انیسویں صدی کی جن کتابوں یا مصنفوں کا علم نہیں تھا، وہ علم ہوا اور دوسرے یہ کہ جن کو کسی کتاب یا مصنف کی تلاش تھی، اس کا پتا ملا اور تحقیق کی کئی گرہیں کھلیں۔

اس سے زیادہ دلچسپ صورتحال قدیم گھرانوں میں اس وقت پیدا ہوئی جب پروگرام کے دوران اچانک کسی خاندان کے کسی بزرگ کا ذکر آ گیا۔ کتب خانے میں جن مصنفوں کی بات چھڑی اب ان کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بزرگوں کا نام نشر ہوتے سنا تو ان گھروں میں دھوم مچ گئی۔ بعض نے ہمیں لکھ کر بتایا اور کچھ نے کتاب کی نقل فراہم

کرنے کی فرمائش کی۔

پروگرام چلتا رہا اور سامعین کے توصیفی خط آتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ ان خطوں کی تعداد کم ہونے لگی اور یوں لگا جیسے لوگوں نے پروگرام کتب خانہ سننا بند کر دیا ہے۔ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ اس وقت پہلے سے زیادہ سامعین ہر اتوار کو باقاعدگی سے یہ پروگرام سن رہے تھے اور یہ سمجھ کر ہمیں خط نہیں لکھ رہے تھے کہ یہ تو ہر اتوار کا معمول ہے۔ اتوار کا دن آئے گا تو کسی پرانی کتاب کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔

ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ کتب خانے کی مقبولیت ختم ہوئی۔ چنانچہ وقت آگیا ہے کہ اسے بند کیا جائے۔ آخری پروگرام میں ابن انشاء مرحوم بھی شریک تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ مسجد اور کتب خانے بھی بند نہیں ہوا کرتے۔

ادھر سے سامعین کے خطوں کا ایک ریلا چلا جس میں شکایتیں کم اور احتجاج زیادہ تھا اور وہ بھی بہت سخت۔ ہر شخص یہ لکھ رہا تھا کہ اول تو آپ (یعنی برطانیہ والے) ہماری کتابیں لے گئے اور اب ان کے دلچسپ حصے پڑھ کر سنا رہے تھے، انہیں بھی بند کر رہے ہیں۔ یہ شکایت بی بی سی میں غور سے سنی گئی اور اس پر غور وخوض ہوا۔

طے یہ پایا کہ برصغیر میں بڑے بڑے پرانے کتب خانے اور قدیم کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ وہاں کوئی جانے کی زحمت نہیں کرتا اور تن آسانی کے اس زمانے میں کون تحقیق کے دکھ اٹھائے اور پرانی کتابوں کی گرد جھاڑ کر ان کی ورق گردانی کرے۔

اس کے ساتھ ہی طے پایا کہ کیوں نہ ہم برصغیر کا دورہ کریں۔ کتابوں کے یہ ذخیرے دیکھیں اور اپنے سننے والوں کو بتائیں کہ برطانیہ والے ساری کتابیں نہیں لے گئے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی جس "جواہر منظوم" کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے، اس کا ایک نسخہ انہیں ہندوستان ہی میں ملا یا نہیں؟

لیجیے صاحب، طے پا گیا کہ رضا علی عابدی پندرہ روز کے دورے پر ہندوستان اور پاکستان جائیں گے اور ایک اور کتب خانہ ترتیب دے کر سامعین کے گلے شکوے دور کریں گے۔

اس طرح میں 1982ء میں برصغیر کے اپنے پہلے سفر پر نکلا مگر اس کا احوال آگے چل کر۔ فی الحال ایک اور پروگرام اور اس کے ایک بے حد معروف کردار کی بات ہوگی۔ پروگرام تھا شاہین کلب اور اس کے کردار تھے سدّھو بھائی!

---------O---------

سدھو بھائی شاہین کلب والے

یہ سنہ 1996ء کی بات ہے، اپنے پروگرام "ریل کہانی" کی ریکارڈنگ کے لیے کلکتہ جانے کی خاطر میں کوئٹہ سے بولان ایکسپریس میں بیٹھا۔ ٹرین کے عملے اور کئی دوسرے مسافروں کو معلوم تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ کوئٹہ سے چل کر جب ٹرین آب گم کے اسٹیشن پر رکی تو عجب تماشا ہوا۔ ٹرین کی آمد کے وقت تفریح کے خیال سے شہر کے جوڑے کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں، وہ جمع تھے کہ کسی طرح انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ بی بی سی لندن کے بچوں کے مقبول پروگرام کے پروڈیوسر رضا علی عابدی اسی ٹرین میں بیٹھے ہیں۔ ذرا دیر میں میرے کمپارٹمنٹ کے آگے نوجوانوں کا مجمع لگ گیا۔ میں کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ سارا مجمع پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور ذرا سوچیے کہ یہ مجمع مجھ سے شاہین کلب کے ہردلعزیز کردار سدھو بھائی کے انتقال پر اظہار تعزیت کر رہا تھا اور سب کا ایک ہی سوال تھا: "بتائیے حقیقی زندگی میں سدھو بھائی کیسے تھے؟"

بڑا مشکل سوال تھا کیونکہ حقیقی زندگی میں محمد علی شاہ مرحوم بی بی سی کی اردو سروس کے کلرک اور ٹائپسٹ تھے مگر ریڈیو پروگرام میں انہوں نے وہ دھوم مچائی تھی کہ ایک بار پاکستان کی فضائیہ کے کچھ ہواباز اپنے طیارے لے کر برطانیہ آئے ہوئے تھے۔ وہ فرصت ملتے ہی بی بی سی کی مشہور عمارت بش ہاؤس پہنچ گئے اور استقبالیہ پر جا کر وہاں بیٹھے ہوئے انگریز عملے سے کہا کہ ہم سدھو بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بیچارے عملے نے کبھی سدھو بھائی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ عمارت میں یہاں سے وہاں تک سدھو بھائی کی تلاش شروع ہوئی اور بالآخر اردو سروس والوں نے وطن کے بجیلے جوانوں کی پذیرائی کی اور کہا کہ اس وقت سدھو بھائی کا جو پروگرام نشر ہونے والا ہے، وہ پہلے سے ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ آپ اسٹوڈیو میں بیٹھ کر اسے سنیے، البتہ محمد علی شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے آپ کو کسی اور دن آنا پڑے گا۔

اردو سروس سے بچوں کا یہ پروگرام بیس سال سے زیادہ عرصے سے جاری تھا۔ مجھ سے

کافی پہلے شاہین کلب کو فیض احمد فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی اور ریڈیو پاکستان کے بدر عالم مرحوم پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ فرض یونس واسطی مرحوم نے سنبھالا، پھر یہی پروگرام ظرافت اور لطافت کے استاد وسیم صدیقی کو سونپا گیا جس میں ان کے ساتھ ریڈیو کی مشہور فنکار سحاب قزلباش بھی تھیں جو سلطانہ باجی کہلاتی تھیں۔ یہ سب تھے لیکن بچوں کے پروگروام میں بچہ ایک بھی نہ تھا اور سوچیے یہ خلا کون پُر کر رہا تھا: محمد علی شاہ عرف سدھو بھائی جو اپنا پورا نام یوں بتایا کرتے تھے: افلاطون یار جنگ ارسطو عرف سدھو بھائی شاہین کلب والے۔

پروگرام میں یہ کردار یونس واسطی کے دور میں داخل ہوا۔ اس وقت کوئی صاحب تھے جو سدھو بھائی کا کردار ادا کیا کرتے تھے کیونکہ محمد علی شاہ تو سیکشن کے کلرک اور اردو ٹائپسٹ تھے اور مائیکروفون کو انہوں نے قریب سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک روز یوں ہوا کہ یونس واسطی ریکارڈنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ کاسٹ کے باقی لوگ آئے تھے مگر سدھو بھائی کا کردار ادا کرنے والے صاحب لاپتہ تھے۔ یہاں تک کہ ریکارڈنگ کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اتفاق سے شاہ صاحب وہیں کہیں گھوم رہے تھے۔ طے یہ پایا کہ کیوں نہ آج انہیں سدھو بھائی بنا دیا جائے۔ وہ بیچارے بلا کے شرمیلے تھے اور زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی تھی جس کا انہیں بہت احساس تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، شاہ صاحب رضامند ہو گئے۔ اب جو ریکارڈنگ ہوئی اور ماسٹر صاحب (جنہیں وہ ماس ساب کہا کرتے تھے) اور سدھو بھائی کے مکالمے ریکارڈ ہوئے تو بڑی تالیاں بجیں۔ اتنی تالیاں کہ جو صاحب عام دنوں میں یہ کردار ادا کیا کرتے تھے، انہیں پیغام بھجوا دیا گیا کہ اب وہ بش ہاؤس آنے کی زحمت نہ کریں۔

یونس واسطی کے دور میں شاہین کلب بہت مقبول ہوا لیکن جب واسطی صاحب کا بی بی سی سے کنٹریکٹ ختم ہوا تو پروگرام کا سربراہ وسیم صدیقی کو بنایا گیا۔ وہ ٹھہرے بلا کے لطیفہ گو۔ ان کا حال یہ تھا کہ انہیں کتنا ہی اعلیٰ لطیفہ سناؤ، وہ ہنسنے کے بجائے ایک اپنا لطیفہ سنانے لگتے تھے۔ خیر! وسیم صدیقی نے سلطانہ باجی اور مشہور صداکار محمود خاں مودی اور سرکردہ گلوکارہ ناہید نیازی اور ان کے شوہر مصلح الدین کو ملا کر ایک ٹیم بنائی۔ مرکزی کردار سدھو بھائی ہی رہے۔ اس کے بعد شاہین کلب کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

اب ہوا یہ کہ بی بی سی کے ساتھ وسیم صدیقی کا کنٹریکٹ بھی ختم ہوا۔ اب سوال یہ تھا کہ اتنی بلندی تک پہنچ جانے والے پروگرام کو کون سنبھالے؟ ذمے دار حضرات کن انکھیوں سے میری

طرف دیکھنے لگے۔ میرا معاملہ یوں تھا کہ میں شفیق الرحمان کو پڑھ کر جوان ہوا تھا اور مجھے احساس تھا کہ اچھا خاصا مزاح لکھ سکتا ہوں۔ جب بی بی سی میں تقرر ہونے لگا تو میں نے طے کیا کہ اپنی مزاح نگاری آئندہ کے لیے بچا کر رکھوں گا اور یہ سوغات بی بی سی کے حوالے نہیں کروں گا مگر پھر ہوا یہ کہ شاہین کلب جیسا مقبول پروگرام سنبھالنے یا نہ سنبھالنے کے لیے جب میرا عندیہ لیا گیا تو مجھے انکار کا کوئی سبب نظر نہیں آیا۔ اس طرح سدھو بھائی کا کردار لکھنے کا فرض مجھے سونپ دیا گیا۔

شاہین کلب کی عجیب روایت یہ تھی کہ اس میں کوئی بچہ شامل نہیں تھا۔ لندن میں صداکاری کرنے والا بچہ ڈھونڈنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے بچوں کو بش ہاؤس لانے اور پوری پوری شام نذر کرنے والے والدین بھی دستیاب نہیں تھے۔ اپنا روزگار چھوڑ کر کون آ سکتا تھا۔ اس لیے بچوں کا یہ پروگرام بچوں کی شرکت سے محروم رہا۔

اب رہ گئے سدھو بھائی جو پروگرام میں پوری ٹیم کے ساتھ شریک ہوتے تھے، بظاہر معمر تھے لیکن باتیں بچوں جیسی کرتے تھے اور وہ بھی اس شان سے گویا بچوں کا دل بہلانے کی خاطر خود بھی بچے بن گئے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس کردار کے لکھنے میں بے شمار امکانات تھے اور اس میں لطیفہ گوئی کے کمالات دکھانے کی خوب خوب گنجائش تھی۔

جب یہ پروگرام ملا تو اس کے شرکاء کی ٹیم منتشر ہو چکی تھی۔ میرے حصے میں سدھو بھائی، رضوانہ اور اکرم منہاس آئے۔ کچھ روز بعد پروین مرزا بھی آ گئیں، پھر شاہدہ احمد بھی شریک ہوئیں اور بالآخر سحاب قزلباش عرف سلطانہ باجی بھی لوٹ آئیں۔ خواتین نے بچوں کی کمی کا احساس مٹا دیا اور شاہین کلب کی مقبولیت اور بڑھنا شروع ہوئی۔ اس کا اندازہ سننے والوں کے خطوط کی تعداد سے ہوتا تھا۔

جس وقت پروگرام میں میرے علاوہ صرف محمد علی شاہ، پروین اور شاہدہ شامل تھیں ان دنوں پروگرام کی تشہیر کے لیے ہم چاروں کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ چھپوایا گیا اور ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ جسے درکار ہو وہ خط لکھ کر منگوا لے۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ غضب ہو گیا۔ غضب یہ نہیں ہوا کہ سننے والوں کے ہزاروں خطوط کی جھڑی لگ گئی۔ غضب یہ ہوا کہ ان سب کو ایک ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیجنے پر جو ڈاک کا خرچ آیا اس سے اردو سروس کے بجٹ کی چولیں ہل گئیں۔ ہمیں ہدایت کر دی گئی کہ بس! آئندہ شاہین کلب کا کوئی پوسٹ کارڈ نہیں چھپے گا۔

سدھو بھائی ہر ہفتے اپنا کوئی قصہ سناتے تھے جو ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ ادھر

اسٹوڈیو میں ہم خود ہنستے ہنستے دہرے ہو جاتے تھے، ادھر سننے والے بھی لوٹ پوٹ ہوتے تھے جیسے ہنسنے کا مرض اُڑ کر لگتا ہو۔ خود ہمارے ہنسنے کا یہ حال تھا کہ پروگرام یا ڈرامے کے اسکرپٹ میں کہیں نہیں تھا کہ "سب ہنستے ہیں" بلکہ وہ ہنسی صحیح جگہ اور بالکل فطری ہوتی تھی۔ یوں اسے ہنسی کہنا بھی درست نہیں، وہ تو قہقہوں کا فوارہ ہوتا تھا۔

ایک بار ایک پروگرام میں سدھو بھائی خود اپنا اور سلطانہ باجی کا قصہ سنا رہے تھے جس میں سلطانہ باجی کمرے کے بیچوں بیچ کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اتنے میں سدھو بھائی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور کرکٹ کی طرح کمنٹری کرنے لگے:

"اب وہ دائیں بائیں دیکھ رہا ہے جیسے چھکا لگانے کی تیاری کر رہا ہو اور اب وہ ذرا پیچھے ہٹا اور اب تیزی سے آگے بڑھا۔ اور اب ایسے لپک رہا ہے جیسے ایک رن لینے کی کوشش کر رہا ہو۔"

ادھر سدھو بھائی کی کمنٹری جاری تھی۔ ادھر سلطانہ باجی مسلسل پوچھے جا رہی تھیں "کون؟ ارے بھئی کون؟ کدھر؟؟ کون کون؟؟"

سدھو بھائی نے انکشاف کر دیا "چوہا۔ آپ کی کرسی کے پائے پر۔"

یہ سنتا تھا کہ سلطانہ باجی چیخ مار کر کرسی پر چڑھ گئیں۔ ادھر چوہے کی پیش قدمی جاری رہی۔ اسے بڑھتا دیکھ کر چیختی چلاتی سلطانہ باجی چھت کے پنکھے سے لٹک گئیں اور لگیں چلانے "سدھو بھائی اس چوہے کے بچے کو ماریے۔" اس پر سدھو بھائی اپنی بندوق اٹھا لائے۔ فرش پر رکھی ہوئی کرسی اور اس پر چڑھتے ہوئے چوہے کو تاک کر نشانہ بنایا اور گولی چلا دی۔ نشانہ چوکا اور گولی جا کر چھت کے پنکھے کو لگی۔ پنکھا ٹوٹا۔ موٹی تازی سلطانہ باجی فرش پر گریں اور چوہا ان کے نیچے کچلا گیا۔

اس طرح سدھو بھائی نے چوہے کا شکار کیا۔

یہ سارا ڈراما بہت مزے کا تھا۔ خصوصاً سلطانہ باجی کا چھت سے لٹک کر شور مچانا بڑا لطف دے رہا تھا۔ ہم سب اپنے منہ میں رومال ٹھونسے ہنسی روک رہے تھے۔ اب یہ ہوا کہ جہاں سلطانہ باجی کو کہنا تھا "سدھو بھائی اس چوہے کے بچے کو ماریے۔" وہ بولیں "سدھو بھائی! اس چوہے کے بچے کو بچایئے۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم لوگوں کے منہ میں ٹھنسے ہوئے رومال نکل گئے اور ہنستے ہنستے ہم سب فرش پر لوٹنے لگے۔ ریکارڈنگ روکنا پڑی اور جب تک ہنسی کا دورہ پڑتا رہا،

ریکارڈنگ رکی رہی۔ ہمارے انگریز انجینئر نے آ کر ہم سب کو پانی پلایا اور بڑی مشکل سے حالات معمول پر آئے۔ کچھ عرصے بعد ہم نے اپنے سننے والوں کو ہنسی کے دورے کی ریکارڈنگ بھی سنوائی۔ اسے سن کر سامعین پر ہنسی کا دورہ پڑا اور کئی روز اس ڈرامے کا ذکر رہا۔

سلطانہ باجی عرف سحاب قزلباش ریڈیو پاکستان کے ڈراموں کی مشہور صداکارہ تھیں۔ میں تو انہیں بچپن سے سنتا آ رہا تھا۔ جب وہ آزادی سے پہلے آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے بچوں کے پروگرام میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ بڑی ہو کر وہ ڈراما آرٹسٹ بنیں اور مجھے کراچی ریڈیو کے جشنِ تمثیل کا ڈراما ''غبارہ'' یاد ہے جو شوکت تھانوی مرحوم نے لکھا تھا جس کا منظر یہ تھا کہ سحاب ایک راکٹ میں بیٹھ کر خلا میں چلی جاتی ہیں جہاں ان پر دہشت طاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے وائرلیس پر چیختی چلاتی ہیں اور زمین پر ان کے ابا جان (خود شوکت تھانوی) اسی وائرلیس پر انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورتحال اس روز شاہین کلب میں تھی۔ اس کے کچھ روز بعد مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں اپنے دوست افضال شیروانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ ہم دونوں دوست برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور افضال کی بیگم اندر باورچی خانے میں توے پر چپاتی ڈال رہی تھیں۔ کسی بات پر میں نے قہقہہ لگایا تو وہ چپاتی ہاتھ میں لیے لیے باہر آئیں اور بولیں ''اب یقین آ گیا۔ شاہین کلب میں وہ قہقہے مصنوعی نہیں ہوتے۔''

اس دوران میں شاہین کلب سننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بی بی سی والے اپنے سننے والوں کی تعداد جاننے کے لیے جو سروے کراتے تھے، ان میں چونکہ صرف بالغوں کو شمار کیا جاتا تھا، اس لیے یہ تو پتا نہ چل سکا کہ سامعین میں بچوں کی تعداد کتنی ہے لیکن اب اتنے زیادہ بڑے بھی شاہین کلب سننے لگے تھے کہ مجموعی تعداد میں بھاری اضافہ نظر آنے لگا۔

شاہین کلب لاکھ کہیں کہ بچوں کا پروگرام تھا لیکن حقیقت میں اسے پورے پورے کنبے ساتھ بیٹھ کر سننے لگے تھے۔ خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں دادا ابا اور نانا جان بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اس نسل کو اس پروگرام نے بہت محظوظ کیا جس میں سدھو بھائی کے دادا حضور کی سوویں سالگرہ ہو رہی تھی اور اس موقع پر کاٹنے کے لیے جو بڑا سا کیک بنوایا گیا تھا اس پر پوری ایک سو شمعیں روشن کی گئیں اور دادا ابا سے کہا گیا کہ ان سب کو پھونک مار کر بجھائیں۔ ان بیچارے کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ بالکل پوپلے تھے۔ انہوں نے بہت پھونکیں ماریں مگر شمعوں کو

نہ بجھتا تھا، نہ بجھیں۔ آخر سدھو بھائی کو ایک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے دادا ابا کا منہ شمعوں کے قریب لے جا کر کہا "اب کیسے پھوپھی پھوپھا۔ پھوپھی پھوپھا۔ پھوپھی پھو پھو پھا۔" یہی کیا گیا۔ دادا ابا کے پوپلے منہ سے ہوا کے ایسے جھونکے نکلے کہ شمعیں اڑ کر گئیں اور سامنے والی دیوار پر چپک گئیں۔

ہمارے بعض قارئین کو شہزادی عابدہ سلطان یاد ہوں گی جو ریاست بھوپال کے آخری فرمانروا حمید اللہ خان کی بڑی بیٹی تھیں اور اگر ریاستیں برقرار رہتیں تو وہ بھوپال جیسی عظیم ریاست کی حکمراں ہوتیں۔ شہزادی عابدہ سلطان بعد میں پاکستان چلی گئیں۔ ان کے بیٹے شہریار خاں پاکستان کے امور خارجہ کے سیکرٹری تھے۔ بعد میں وہ ہائی کمشنر مقرر ہو کر برطانیہ آئے۔ اسی دوران شہزادی عابدہ سلطان بیٹے کے پاس لندن آئیں اور ہائی کمشنر سے دلچسپ فرمائش کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ بی بی سی لندن کی اردو سروس کے پروگرام شاہین کلب میں حصہ لینے والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہائی کمیشن نے بی بی سی سے پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ جواب ملا: سر آنکھوں پر۔ ضرور تشریف لائیے۔ چنانچہ وہ شاہین کلب کے اسٹوڈیو میں آئیں اور پروگرام میں طویل انٹرویو دیا۔ سدھو بھائی نے ان سے ان کے بچپن کے بارے میں سوال کیے۔ مثلاً ان سے پوچھا کہ کیا آپ شرارتیں کرتی تھیں؟ اور یہ کہ بزرگوں نے کبھی آپ کی شرارتوں پر آپ کے کان کھینچے۔ انہوں نے مزے مزے کے جواب دیے اور بزرگوں کے ادب کے بارے میں سننے والوں کو بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔

بزرگوں پر یاد آیا کہ ان ہی دنوں مجھے سندھ کے بڑے شہر حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور مجھے اپنے وقت کے بڑے عالم علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان کا علم نور بن کر ان کے چہرے سے پھوٹتا تھا۔ وہ شاہین کلب کے بڑے مداح نکلے۔ کہنے لگے کہ ہر ہفتے ضرور سنتا ہوں۔

میں نے کہا "علامہ! وہ تو بچوں کا پروگرام ہے۔"

کہنے لگے "میرے بچے سنتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر میں بھی اشتیاق سے سنتا ہوں۔"

میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنے بچوں سے مجھے بھی ملوائیے۔

علامہ نے فوراً آواز دے کر انہیں بلا لیا۔ ان میں غالباً دو ڈاکٹر اور ایک پروفیسر تھے۔

میں اپنے اسی دورے میں لاہور پہنچا اور وعدے کے مطابق لاہور کے نواحی گاؤں

اجودھیاپور والوں سے ملنے گیا۔ وہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ ایک دیگ بھر کے چنے کی دال اور دوسری دیگ میں چاول پکے۔ گاؤں کی ساری آبادی جمع ہو گئی۔ بڑے دالان میں چارپائیاں ڈال دی گئیں اور اتنا بڑا مجمع مجھے گھیر کے بیٹھ گیا۔ اب امتحان کی کڑی گھڑی آن پہنچی۔ مجھ سے فرمائش ہوئی کہ شاہین کلب کا وہ واقعہ سنایئے جس میں آپ کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے اور سدھو بھائی بھولی ہوئی باتیں یاد کرنے میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔

میں اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو پروگرام کا ٹیپ یا اسکرپٹ ساتھ لے جاتا۔ لاکھ معذرت کی لیکن گاؤں والوں نے میری ایک نہ سنی۔ تھک ہار کر میں نے اپنا اور سدھو بھائی کا وہ تاریخی واقعہ سنانا شروع کیا:

میں: ایک بار یہ ہوا کہ ایک خاتون کا وہ کنویں میں گر گیا...وہ...وہ...

سدھو: شوہر؟

میں: نہیں دوپٹہ۔

سدھو: اچھا۔ دوپٹہ۔

میں: تو دوپٹہ نکالنے کے لیے کنویں میں اسے اتارا گیا...اُسے...اُسے...

سدھو: صدر ناصر کو؟

میں: جی نہیں...اسے...اسے...

سدھو: دلیپ کمار کو؟

میں: جی نہیں۔ غوطہ خور کو۔

سدھو: اچھا غوطہ خور کو۔

میں: وہ کنویں میں اترا اور کچھ دیر بعد وہ نکال کے لایا...وہ...وہ...

سدھو: جہاز؟

میں: جی نہیں...وہ...وہ...

سدھو: مگر مچھ؟

میں: جی نہیں۔ ایک پرانا جوتا۔

سدھو: اچھا جوتا۔

میں: جی ہاں۔ پھر کنویں میں وہ ڈالی گئی۔

سدھو: ان مکیکشر؟

میں: جی نہیں...وہ...وہ...

سدھو: جیبی گھڑی؟

میں: جی نہیں۔ لال دوا۔

سدھو: اچھا۔ لال دوا۔ اوہو، آپ کی یادداشت تو بہت کمزور ہو گئی ہے...وہ...کیا نام ہے آپ کا؟

میں سوچنے لگا کہ ان دور دراز دیہات میں رہنے والے یہ دن بھر کے تھکے ہارے غریب شام کو ریڈیو کے گرد جمع ہو کر ہمارا پروگرام سنتے ہوں گے تو کتنا جی بہلتا ہوگا اور ساری تھکن دور ہو جاتی ہوگی ان کی۔

اس پر اور اپنے قہقہے کی بات پر یاد آیا کہ مجھے کراچی سے کچھ دور ٹھٹھہ کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ گاؤں کے کچے پکے مکان تو اونچی جھاڑیوں کے گھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کا مہمان خانہ گاؤں سے باہر بنا ہوا تھا جہاں سرِ شام چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں۔ لوگ مجھے گھیرے بیٹھے تھے اور مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کسی بات پر میں نے قہقہہ لگایا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ گاؤں کے اندر چار سال کا ایک بچہ میرا قہقہہ سن کر چونکا اور ماں سے اپنی سندھی زبان میں کہا کہ وہ ریڈیو والا آ گیا۔

جو لوگ خوشی کماتے ہیں، وہ خوش نصیب ہوتے ہیں اور جو لوگ خوشی بانٹتے ہیں، وہ بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں۔

شاہین کلب کی چٹپٹی باتوں میں سدھو بھائی کا حلوے کا شوق بہت رنگ بھرتا تھا۔ ان کے مکالموں میں حلوے کا ذکر ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھار کہتے:

اے حلوۂ دال چنا، دنیا کی رونق تجھ سے ہے

ایک بار ہندوستان یا پاکستان سے کسی نے حلوے کا پارسل بنا کر سدھو بھائی، معرفت بی بی سی لندن کے پتے پر بھیج دیا۔ پارسل کچھ ٹوٹا، کچھ پھوٹا مگر ڈاک خانے والوں نے ہزار جتن کر کے اسے بی بی سی کے دفتر میں پہنچا دیا۔ پوری عمارت میں تہلکہ مچ گیا کہ پارسل میں ایک عجیب و غریب چیز آئی ہے۔ کسی ہندوستانی ملازم نے یہ یقین تو دلا دیا کہ اس میں بارود نہیں بلکہ ہندوستانی یا پاکستانی میٹھا حلوہ ہے۔ اس کے بعد اس سے بھی بڑا سوال اٹھا۔ اتنی بڑی عمارت میں کام کرنے والے تین ہزار افراد میں یہ مسٹر سدھو بھائی کون ہیں؟

خدا جانے کیسے افلاطون زمانہ، افراسیاب یار جنگ ارسطو عرف سدھو بھائی شاہین کلب والے کو ڈھونڈ نکالا گیا اور ان کا حلوہ انہیں پیش کر دیا گیا۔ پھر کیا ہوا، اس کے لیے اگلا قصہ سنیے۔

ہمارے ساتھی علی احمد خاں جب بی بی سی لندن میں ملازم ہو کر آئے اور ان کے بچے بھی لندن آئے تو بچوں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ کیا ہم سدھو بھائی سے مل سکتے ہیں؟ علی احمد خاں نے کہا کہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟ انہیں کسی روز کھانے پر اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ سدھو بھائی کو دعوت دی گئی۔ ان کے لیے مزے مزے کی چیزوں کے علاوہ بہت سا حلوہ پکایا گیا اور سدھو بھائی کے سامنے سجا دیا گیا۔ تب یہ بھید کھلا کہ وہ ذیابیطس کے مریض ہیں اور حلوہ یا کوئی بھی مٹھائی نہیں کھا سکتے۔

بچوں نے حیران ہو کر پوچھا "تو سدھو بھائی، پروگرام میں وہ سب کہنے کی باتیں تھیں؟"

کچھ جھینپ کر اور کچھ شرما کر بولے "ہاں۔"

ایسی شخصیت تھی ان کی۔ ایک بار بی بی سی کے حکام بالا نے کہا کہ وہ اتنے مقبول ہیں، کیوں نہ انہیں ہندوستان پاکستان کے دورے پر بھیجا جائے۔ یہ سن کر میں مچل گیا اور کہا کہ وہ بہت سیدھے ہیں۔ اس لیے ان کا نام سدھو بھائی ہے۔ لوگ ان سے لطیفوں اور قہقہوں کی توقع کریں گے۔ چنانچہ ان کے ساتھ پروگرام کے نہ صرف سارے کردار بلکہ سارے اسکرپٹ بھی بھیجنے پڑیں گے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرا دل تو بہت دکھا لیکن اگر وہ چلے جاتے تو خدا جانے ان کا دل کتنا دکھتا۔ ان کا کمال مکالموں کی ادائیگی میں تھا۔ ان کی زبان میں اک ذرا سی لکنت تھی جسے وہ اس خوبی سے چھپاتے تھے کہ ان کی باتوں میں ایک عجیب سا لطافت کا رنگ بھر جاتا تھا۔ اسی بنا پر لاکھوں سننے والوں کے چہیتے تھے۔

ایک روز یہ ہوا کہ ان پر جنہیں ہم لوگ سدھو بھائی نہیں بلکہ شاہ صاحب کہتے تھے، فالج کا حملہ ہوا۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا جہاں انہیں فالج کے تمام مریضوں کی طرح لٹا لیا گیا اور وہ پروگرام سے غیر حاضر ہو گئے۔ ہم نے سننے والوں کو بتایا کہ سدھو بھائی پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ اسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔

یہ اعلان ہونا تھا کہ سننے والوں خصوصاً بچوں کے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ اتنی دعائیں، اتنی دعائیں کہ شمار کرنا دشوار ہو گیا۔ ہم نے یہ کیا کہ ان خطوں کے تھیلے بھر بھر کر اسپتال پہنچانے

شروع کر دیے۔ شاہ صاحب بستر پر لیٹے لیٹے دن بھر وہ خط پڑھا کرتے۔ دعاؤں کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ادھر ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ شاہ صاحب کی حالت سنبھل رہی ہے۔

شاہ صاحب دو تین مہینوں کے اندر صحت یاب ہو کر کام پر واپس آ گئے۔ ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اتنی تیزی سے صحت یابی کیسے ہو گئی۔ شاہ صاحب ایک سال بعد طبی معائنے کے لیے اسپتال گئے اور واپس آ کر بتایا کہ جو مریض ایک سال پہلے داخل تھے، وہ اب تک داخل ہیں۔

شاہین کلب سننے والوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ شاہ صاحب کو دفتر میں ہلکا پھلکا کام دیا جانے لگا۔ البتہ ریڈیو پروگرام میں انہیں دشواری ہونے لگی۔ فالج اپنے کچھ اثرات چھوڑ گیا تھا۔ اس پر ہم نے یہ کیا کہ سدھو بھائی کے پرانے پروگراموں کی ریکارڈنگ اس طرح چلائی جیسے یہ نئے پروگرام ہیں لیکن وہ ذخیرہ بھی کچھ عرصے بعد ختم ہو گیا مگر ہم پروگرام کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔

پروگرام شاہین کلب میں بچوں کے گانے کی روایت پرانی تھی۔ نازیہ حسن اور ان کے بھائی پاکستان ٹیلی ویژن پر بچوں کے گیت گاتے ہوئے لندن آئے تھے، وہ دونوں شاہین کلب میں بھی گانے لگے۔ پھر مصلح الدین اور ان کی اہلیہ ناہید نیازی بھی پاکستان ٹیلی ویژن کی طرح بی بی سی سے بھی بچوں کے نغمے گانے لگے۔

میں نے بھی یہ سلسلہ یوں جاری رکھا کہ پاکستان سے بچوں کے گانوں کے ریکارڈ لے آیا اور شاہین کلب میں نشر کرنے لگا۔ یہ گانے خصوصاً ہندوستان کے بچوں کے لیے بالکل نئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فرمائش پر سہیل رعنا کا ترتیب دیا ہوا نغمہ "شاوا بھئی شاوا" بار بار نشر ہوا لیکن موسیقار خلیل احمد کے ایک نغمے نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بول یوں تھے "پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہیے" اس دوران ایک دلچسپ کام ہوا۔ ہم لوگوں نے یعنی شاہین کلب کی ٹیم نے بچوں کے نغمے خود لکھ کر خود ہی گانے شروع کر دیے۔ ان میں تھوڑے سے بے سُرے سدھو بھائی بھی شامل ہوتے تھے جن کی آواز الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ ایک بار ایک گانا انہوں نے قوالی کے انداز میں گایا۔ یہ گانا میں نے لڑکپن میں آل انڈیا ریڈیو سے سنا تھا اور اس کا ایک بول مجھے یاد تھا: "میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟"

اس روز سدھو بھائی کی قیادت میں ہم نے یہ قوالی گائی۔

سدھو: میں امتحان میں بیٹھا تھا اور خوف سے تھر تھر کانپا تھا

پھر ہاتھ میں پرچہ آیا تھا اور پہلا سوال یہ لکھا تھا

سب: کیا؟؟؟

سدھواور سب میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟

جب گانے کا سلسلہ چلا تو پروگرام میں دردانہ انصاری اور آغا سرور بھی شامل ہو گئے۔ دونوں سریلے تھے اور آغا سرور تو غضب کے کامیڈین اور بلا کے نقال تھے۔ ایسی ایسی نقلیں اتارتے تھے اور آوازیں نکالتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا تھا۔

ہماری شامتِ اعمال، ایک بار پروگرام میں آغا سرور کو ایک ہکلے کا کردار دے دیا گیا۔ غضب ہو گیا۔ انہوں نے ہکلے پن کا ایسا مظاہرہ کیا کہ توبہ ہی بھلی۔

ان دنوں پاکستان کے سرکردہ موسیقار سہیل رعنا جب بھی لندن آتے تھے، شاہین کلب میں ضرور شامل ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سے نغمے کی طرز بنا کر گئے جس کے بول لکھنے میں ممتاز شاعر افتخار عارف نے ہاتھ بٹایا:

دھیان ذرا رکھنا کہیں یہ ہاتھ نہ چھوٹیں
دیکھنا کچی دوستیوں کے ساتھ نہ چھوٹیں
ہاتھ سے ہاتھ ملیں تو دنیا اُجلی کر دیں
ہاتھ سے ہاتھ ملیں، دعائیں سچی کر دیں
ہاتھ سے ہاتھ ملیں، دلوں میں روشنی بھر دیں
دھیان ذرا رکھنا

میں کبھی شعر نہیں کہتا، نغمے لکھنا اور ان کی طرزیں بنانا تو دور کی بات ہے مگر بچوں کی خاطر میں نے اپنا قلم اور کی بورڈ سنبھالا اور شاہین کلب کے لیے کئی نغمے تیار کیے۔ اپنے ایک گیت پر مجھے بجا طور پر ناز ہے، جس کی چلتی ہوئی طرز راگ بھیرویں سے متاثر تھی۔ اس کے بول کچھ یوں تھے:

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا ایک ننھا منا تارا
میں نے اس کو بلایا، میں نے اس کو پکارا
یوں تو چپکے چاپ کھڑا تھا لیکن مجھ کو دیکھ رہا تھا
شاید وہ بھی سوچ رہا تھا، میرے دل میں سمائے گا
پھر وہ جگنو بن کے چمکا اور آکاش میں ایسے لپکا

جیسے پاؤں پاؤں چل کے میری گود میں آئے گا
میں نے اس کو پکارا، میں نے اس کو بلایا
وہ تو کرن کرن میرے گھر میں چلا آیا، میرا ننھا منا تارا
وہ ہے ساتھ نبھانے والا مجھ کو ٹوٹ کے چاہنے والا
جب دل غم سے بوجھل ہو تو میری آس بندھاتا ہے
مجھ سے کھیلے آنکھ مچولی باتیں کرکے بھولی بھولی
میرا ننھا سا ہمجولی میرا جی بہلاتا ہے
ایسا اچھا ساتھی پایا پھر تو میرا جی بھی چاہا
میں بھی دور کروں اندھیارا میں بھی بن جاؤں اک تارا
میں ہوں ننھا منا تارا

بچوں کے پروگرام میں بچوں کی تفریح اور دلچسپی کے لیے کئی فیچر شروع کیے جو اکثر معلوماتی تھے۔ سب سے پہلے ہم نے ایک سلسلہ وار پروگرام شروع کیا جس کا عنوان ''مرض اور مسیحا'' تھا۔ اس میں ڈرامے کی شکل میں مختلف بیماریوں اور دوا علاج کی تحقیق اور دریافت کے قصے سنائے جاتے تھے۔ چیچک کا ٹیکہ کیسے اور کس نے ایجاد کیا۔ ملیریا کے دم توڑتے مریض پرانے تالاب کا پانی پی کر کیسے صحت یاب ہو گئے۔ پنسلین کس اتفاق سے دریافت ہوئی۔ بچوں نے یہ سب دلچسپی سے سنا۔

اسی طرح ایک پروگرام کا عنوان ''سب سے پہلے'' تھا جس میں بتایا جاتا تھا کہ کون سا کام سب سے پہلے کب اور کہاں ہوا۔ مثلاً تاریخ میں سب سے پہلی ہوائی ڈاک الٰہ آباد کی تاریخی نمائش سے شروع ہوئی تھی۔ (1910ء)

ایک اور پروگرام ''سوال یہ ہے'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا جس میں دلچسپ سوالوں کے جواب آسان زبان میں دیے جاتے تھے۔

جن دنوں میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری میں انیسویں صدی کی بھولی بسری اور نایاب کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا بہت سی ایسی کتابیں ملیں جو اس زمانے کے بچوں کے لیے لکھی گئی تھیں اور میرے بچوں کے دادا نے پڑھی ہوں گی۔ اس پر ''دادا کی کتابیں'' کے عنوان سے پروگرام شروع کیا گیا اور سننے والوں کو وہ قدیم کتابیں پڑھ کر سنائی گئیں جو ان کے دادا پردادا

پڑھتے ہوں گے۔ بعد میں محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتابوں سے انتخاب سنگِ میل پبلی کیشنز نے "الٹا گھوڑا" اور "ظالم بھیڑیا" کے عنوان سے شائع کیا۔

پروگرام "شاہین کلب" کی ایک اور بے مثال کامیابی اس کے انعامی مقابلے تھے۔ چونکہ سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے ان مقابلوں میں بلا مبالغہ ہزاروں بچے حصہ لیتے تھے۔ پروگرام کے دو مقابلے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

شاہین کلب میں ماں کی محبت کا ذکر بہت ہوتا تھا اور خلیل احمد کا بچوں کا کورس "پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہیے، تیرے آنچل کی ٹھنڈی ہوا چاہیے" مسلسل آنے والی فرمائشوں پر نشر ہوا کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے ہم نے سننے والوں کو دعوت دی کہ وہ ماں کی محبت کے بارے میں اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ لکھ کر بھیجیں۔ یہ اعلان تو کمال کا ثابت ہوا۔ بچوں اور بڑوں سب نے ماں کی محبت کے بارے میں دل پر اثر کرنے والے ایسے ایسے واقعات لکھ کر بھیجے کہ انہیں اسٹوڈیو میں پڑھتے پڑھتے ہم سب کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

اس مقابلے میں نو سو خط آئے۔ ان میں قابلِ غور خط چھانٹنے کا کام ہم سب نے آپس میں بانٹا اور پھر جو بہت اچھے خط چنے گئے ان میں سے انعام پانے والے دس بارہ خط چننے کا فرض ذرا سوچ کے سونپا گیا۔ اپنے وقت کی بہت بڑی ادیبہ قرۃ العین حیدر کو۔

میں نے انعام کے لیے چنی جانے والی ساری کہانیاں احتیاط سے رکھیں جنہیں بعد میں سنگِ میل پبلی کیشنز نے "پیاری ماں" اور "میری امی" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

اس انعامی مقابلے کی کامیابی سے متاثر ہو کر ہم نے دوسرا مقابلہ کرایا اور اپنے سننے والوں کو دعوت دی کہ گھریلو یا پالتو یا کسی بھی جانور کے تعلق سے کوئی واقعہ پیش آیا ہو تو لکھ کر بھیجئے۔ اس کے جواب میں دور دور سے سات سو خط آئے اور اکثر خط اتنے دلچسپ اور شگفتہ تھے کہ انہیں چھانٹنے کا وقت ہنستے ہنستے ہی گزرا۔ انعام کسے دیا جائے۔ یہ فیصلہ ہم نے اس دور کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی پر چھوڑا۔

وہ سارے قصے کہانیاں بھی لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔ ایک کتاب کا نام "چمپا" اور دوسری کا "مُنّن مُنّن" ہے۔ کئی ایسے لوگوں نے یہ کتابیں پڑھیں جن کی تحریریں ان میں شامل ہیں۔ بس فرق یہ ہوا کہ لکھتے وقت وہ بچے تھے اور اب کئی کئی بچوں کے والدین ہیں۔ ماشاءاللہ۔

شاہ صاحب کی علالت کے بعد پروگرام میں وہ پہلی سی آب وتاب نہیں رہی۔ سدھو بھائی کمزور ہو گئے اور ہر ایک کوشش کی تھی کہ ان پر کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ ہم پرانے ٹیپ چلا چلا کر ان کے قصے دہرا رہے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ عابدی بھائی میرا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے مجھے پروگرام میں شامل رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر ہفتے مزاحیہ خاکے لکھنا اگرچہ بہت مشکل نہیں لیکن لکھتے لکھتے آٹھ نو سال گزر جائیں تو مزاح کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ اب مجھے ''جرنیلی سڑک'' اور ''شیر دریا'' جیسے بڑے پروگرام ترتیب دینے کے لیے لمبے لمبے دوروں پر جانا تھا۔ میں شاہین کلب پیش کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا۔

اس دوران مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے یہ سوچ کر کے اصل ریکارڈنگ کے ٹیپ تو محفوظ ہیں، میں نے مکالموں کے مسودے بچا کر نہیں رکھے۔ میں ریٹائر ہو گیا اور میری جگہ آنے والی نئی نسل کو ان ٹیپوں کی نہ تو اہمیت کا احساس ہے نہ ان کی قدر ہے۔ وہ ادھر اُدھر رُل گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہوا کہ سدھو بھائی، یعنی ہمارے محمد علی شاہ انتقال کر گئے۔ میرے کچھ ساتھیوں نے پروگرام زندہ رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اب وہ بات آنی مشکل تھی۔

12 اکتوبر سنہ 1985ء کو شاہین کلب کا ایک ہزارواں پروگرام نشر ہوا تھا جس کا ٹیپ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس مقام پر اپنے قارئین اور شاہین کلب کے پرانے مداحوں کے لیے اس خصوصی پروگرام کا مسودہ پیش خدمت ہے۔ بی بی سی میں السلام علیکم کہنے کا رواج نہیں تھا۔ شاہین کلب نے اس رواج کو توڑا۔ لیجیے، پڑھیے اور لطف اٹھایئے:

SHAHEEN CLUB

C 5R77 C 1000 X

12 OCTOBER 1985

سب مل کر: السلام علیکم۔

عابدی: لو بھئی۔ یہ رہا ہمارا تمہارا شاہین کلب اور آج یہ اس کا ایک ہزارواں پروگرام ہے۔

سدھو: یعنی بوڑھا ہو گیا ہے۔

پروین: آپ کی طرح۔

آغا: آج ایک ہزارواں پروگرام ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔

پروین: مجھے یقین ہے کہ آج نہ صرف ہمارے نئے سننے والے بلکہ پرانے سننے والے بھی

بہت خوش ہوں گے جو ایک ہزار ہفتے پہلے شاہین کلب سن چکے ہوں گے۔

سلطانہ: میری طرف سے ان تمام سننے والوں کو بہت بہت مبارکباد جو آج اپنے پروگرام شاہین کلب کا ایک ہزارواں ہفتہ منا رہے ہیں۔

سدھو: ارے صاحب، آپ لوگ ایک ہزار ہفتے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے وہ دن نہیں دیکھا جب کرکٹ کے میدان میں میرے ایک ہزار رن پورے ہوئے تھے۔

سب: (حیرت سے) ایک ہزار رن!!

سدھو: جی ہاں۔ ذرا سوچیے۔ میں نے کس شان سے دایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر بلا گھمایا تھا۔ ہوا کٹنے کی آواز ہوئی تھی: شائیں! اور گیند نیلے آسمان کو چھوتی ہوئی میدان سے باہر چلی گئی تھی۔

سلطانہ: بڑی تالیاں بجی ہوں گی۔

سدھو: ارے صاحب۔ اتنی تالیاں بجیں کہ تین دن تک لوگوں کی ہتھیلیوں میں درد ہوتا رہا اور میرے کانوں میں.....

پروین: اچھا سدھو بھائی۔ شاید اسی روز سے آپ اونچا سنتے ہیں۔

سدھو: جی! کیا کہا آپ نے؟

پروین: (چیخ کر) جی کچھ نہیں۔

عابدی: مگر سدھو بھائی۔ ایک ہزار رن بنانے کے لیے تو آپ کو بہت دوڑنا پڑا ہوگا۔ ٹانگیں شل ہوگئی ہوں گی۔

سدھو: (فخریہ) ہونہہ۔ آپ کا یہ بھائی کبھی دوڑ کر رن نہیں بناتا تھا۔ بس بلا تھام کر وکٹوں کے سامنے جم کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کھمبے کی طرح۔

سلطانہ: کتوں کو بہت آسانی ہو جاتی ہوگی۔

سدھو: جی؟ کچھ کہا آپ نے؟

عابدی: ہاں تو وہاں کھڑے کھڑے آپ چوکے اور چھکے مارتے رہتے تھے؟

سدھو: جی۔ بلکہ میرا مطالبہ تھا کہ چوکے اور چھکے کی طرح اٹھے بھی ہونے چاہئیں۔

پروین: وہ کب؟

سدھو: جب گیند شہر سے باہر نکل جائے۔

آغا: کمال ہے۔آپ نے ایک ہزار رن بھی بنالیے اور دوڑے بھی نہیں۔

سدھو: مگر اس روز جب میں نے تاریخی چھکا مارا تھا تو نہ صرف میں خود دوڑا بلکہ دونوں ٹیموں کے بائیس کھلاڑی، دونوں امپائر اور پانچ لاکھ کا مجمع بھی دوڑا۔

سلطانہ: (حیران ہو کر) پانچ لاکھ۔

پروین: سدھو بھائی۔ٹھیک ٹھیک لگائیے۔

سدھو: (جھینپ کر) میرا مطلب ہے پانچ سو۔

عابدی: مگر کیسے؟

سدھو: ارے صاحب۔اس کا بھی بہت دلچسپ واقعہ ہے۔

سلطانہ/پروین: ہمیں بھی سنائیے۔

سدھو: سنیے۔جب میرے ساڑھے نو سو رن ہو گئے تو سارے شہر کو اندازہ ہو گیا کہ آج ایک ہزار رن پورے ہو جائیں گے اور دنیا کے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔اب تو ہر جگہ دھوم مچ گئی کہ آج کرکٹ کی تاریخ میں بڑا کارنامہ ہونے والا ہے۔عجائب گھر والوں نے اعلان کر دیا کہ وہ آج کے میچ کی گیند پانچ لاکھ روپے میں خریدیں گے۔

سلطانہ: (حیران ہو کر) پانچ لاکھ؟؟

پروین: سدھو بھائی، ٹھیک ٹھیک لگائیے۔

سدھو: (جھینپ کر) میرا مطلب ہے ایک لاکھ۔

عابدی: اچھا پھر؟

سدھو: بس یہ اعلان کیا ہوا، بھئے غضب ہو گیا۔ارے صاحب شہر کی ساری آبادی میچ کے میدان میں پہنچ گئی۔ہر ایک نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میری تاریخی گیند اچک لے گا۔ میرے رن بنتے جا رہے تھے۔سارا مجمع زور زور سے گنتا جا رہا تھا۔

سب مل کر: نو سو بیاسی۔نو سو چھیاسی۔نو سو نوے۔نو سو چورانوے۔

پروین: کیا حالت ہو گی۔

سدھو: ارے صاحب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔کسی نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لے لیے۔کسی نے پتلون کے پائینچے چڑھائے۔لوگوں نے دھوتیاں گھڑس لیں اور یوں تیار ہو گئے جیسے سیٹی بجتے ہی دوڑ پڑیں گے۔

سلطانہ: اور پھر وہ تاریخی چھکا لگا ہوگا۔

سدھو: جی ہاں اور لوگوں نے میرے رن گنے۔ تو سو چورانوے اور اگلی گیند پر میں نے چھکا لگایا تو......

آغا: لوگوں نے نعرہ لگایا ہوگا..... ایک ہزار!

سدھو: جی نہیں۔ انہوں نے گیند آسمان کی طرف جاتے دیکھ کر نعرہ لگایا: دوڑ بے دوڑ۔ سیکڑوں کا مجمع گیند کی طرف دوڑ پڑا۔ ارے صاحب، ایک لاکھ روپے کی گیند تھی وہ۔

پروین: سدھو بھائی۔ دوڑنے والوں میں سب سے آگے کون تھا؟

سدھو: جی۔ یہ آپ کا بھائی۔

سلطانہ: آپ تھے؟

سدھو: جی ہاں۔ گیند ہوا میں جا رہی تھی اور سارا مجمع نیچے دوڑ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں گیند پر جمی تھیں۔ آگے آگے میں تھا، کرکٹ کے لباس میں۔ البتہ میرے آگے امپائر جشید تھے، امپائر کے لباس میں۔

پروین: ان سے بھی آگے کوئی تھا؟

سدھو: جی ہاں۔ بغیر ڈھکن کا گٹر۔

آغا: اُف بے چارے۔

سدھو: سارا مجمع دوڑ رہا تھا۔ گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے۔ اچانک میرا پیر ایک کتے کی دم پر پڑا۔ کتا چیخ مار کر اچھلا اور میرے پیچھے آنے والے مولوی شیر علی کو جھنجھوڑنے لگا۔ مولوی شیر علی گرے تو ان کی ٹوپی دور گئی جس میں خاں صاحب الجھ گئے۔ خان صاحب کے ہاتھ میں جو جوشاندے کی پڑیا تھی، وہ اچھل کر رشید صاحب کے منہ پر گی۔ رشید صاحب کا چشمہ ہوا میں اڑا اور لالہ جسی پرشاد کی بڑی سی ناک سے ٹکرایا۔ لالہ جی نے گالی دینے کے لیے جو منہ کھولا تو ان کی بتیسی نکل کر سائیکل پر دوڑنے والے محمد گل کی گود میں گری۔ محمد گل بوکھلا کر گرا تو حافظ عبدالرشید کی ٹانگ اس کی سائیکل کے پہیوں میں آ گئی۔ حافظ جی اوندھے منہ گرے۔ ان کی صورت دیکھ کر نور محمد نے ہنسنے کے لیے اپنا پیٹ پکڑنا چاہا مگر ہجوم زیادہ تھا۔ غلطی سے اس نے غلہ منڈی والے لالہ جی کا پیٹ پکڑ لیا۔ انہوں نے شاید دھوتی کس کر نہیں باندھی تھی۔ لوگ منہ پھیر کر آگے نکل گئے۔

دور تک لالہ جی کی آواز آتی رہی: یہ بے ایمانی ہے، یہ بے ایمانی ہے۔

پروین: اور گیند کہاں گئی؟

سدھو: وہ تو ہوا میں چلی جارہی تھی۔ اچانک سفید داڑھی والے چاچا خیرالدین کہیں سے نکلے اور میرے آگے آگے دوڑنے لگے۔ ان کی نگاہیں بھی گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے رنگریز کپڑے رنگنے کے لیے بڑے سے کڑھاؤ میں کالا رنگ پکا رہے تھے۔ چاچا خیرالدین اوندھے منہ رنگ میں گرے۔ ایک سال تک ان کی داڑھی کالی رہی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تین شادیاں اور کرلیں۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: وہ ہوا کے رخ پر چلی جارہی تھی۔ راستے میں ایک بارات جارہی تھی۔ آگے آگے بینڈ والے تھے۔ پیچھے پیچھے دولہا گھوڑے پر سوار تھا۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ گیند ایک لاکھ روپے کی ہے، بینڈ والے بھی گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ان کا خیال تھا گیند کو اپنے بھونپو میں کیچ کرلیں گے۔ ادھر دولہا نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے گیند کے پیچھے دوڑانے لگا۔ راستے میں اس کا چاندی کا سہرا بجلی کے تاروں میں الجھ گیا۔ سامنے محمد علی ہائی اسکول کی چھٹی ہورہی تھی۔ اس کے لڑکے نکل کر گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہارون ٹیکسٹائل مل کے مزدور چھوٹ رہے تھے، وہ بھی دوڑ پڑے۔ اس روٹ کی بسیں بھی دوڑ میں شامل ہوگئیں اور مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے والی ٹولی نے بھی یاہو کا نعرہ لگایا اور ریزگاری سے بھرے لکڑی کے ڈبے بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑنے لگی۔

آغا: بڑا مجمع دوڑ رہا ہوگا؟

سدھو: ارے صاحب اب تو سودا بیچنے والے بھی ساتھ دوڑنے لگے۔ کوئی پان لگا لگا کر دوڑنے والوں کو دے رہا تھا۔ کوئی بھنے ہوئے گرم گرم بھٹے دے رہا تھا اور ایک چاٹ والا تو دوڑتا جارہا تھا اور گول گپوں میں سونٹھ کا پانی بھر بھر کر اسکور لکھنے والے کو کھلاتا جارہا تھا۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: زناٹے کے ساتھ اڑی چلی جارہی تھی۔ محلے میں کسی کے گھر بچہ ہوا تھا۔ باہر ایک ٹولی

دوپٹے لہرا کر اور تالیاں بجا کر جیو جیو رے للا۔ جیو جیو رے للا گا رہی تھیں۔ گیند کی خبر سنتے ہی وہ بھی تالیاں بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑی۔ ان کی آواز آ رہی تھی۔ (تالیاں بجاتے ہوئے) اے مردارو، ہٹو ہمارے سامنے سے، گیند میں پکڑوں گی۔

عابدی: اور سدھو بھائی آپ کہاں تھے؟

سدھو: سب سے آگے۔ میرے پیچھے امپائر ہارون تھے۔ ہماری نظریں گیند پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک گیند کی رفتار سست ہوئی۔ مجمع نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی رفتار بڑھا دی۔ امپائر ہارون مجھ سے آگے نکل گئے۔ گیند اور نیچے ہوئی اور بہت گہرے دریا کے پل پر گر کر ٹھہر گئی۔ امپائر ہارون لپکے۔ گیند نے مڑ کر پیچھے مجمع کو دیکھا۔ ایک فاتحانہ ہنسی ہنسی اور غڑاپ سے نیچے دریا میں جا گری۔ امپائر ہارون تن کر کھڑے ہو گئے اور اسکور لکھنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائے: چھکا۔

---------O---------

موتی علم و حکمت کے

فیض احمد فیض مرحوم لندن آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے خوش ہو کر بتایا کہ ہندوستان پاکستان میں بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابوں کے ذخیرے دیکھنے جا رہا ہوں۔ واپس آ کر ریڈیو کے لیے ایک دستاویزی پروگرام تیار کروں گا۔ فیض صاحب نے اتنا ہی خوش ہو کر پوچھا کہ کتنے عرصے کا دورہ ہوگا۔ میں نے کہا "ایک ماہ۔" وہ صاف نہیں سن سکے اور بولے کہ ایک سال تو اس کام کے لیے بہت کم ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اس روز سچ نہیں بولا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اتنے بڑے کام کے لیے بی بی سی والے مجھے صرف پندرہ دن دے رہے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ فیض صاحب کیا کہیں گے، میں نے ایک ماہ کی نوید سنا دی۔

پھر یہ ہوا کہ جب میں برصغیر کے دورے پر پہنچا اور قدیم کتابوں کے ذخیروں کی کھوج میں نکلا تو اندازہ ہوا کہ فیض صاحب سچ کہتے تھے، اتنے بڑے کام کے لیے ایک سال تو کچھ بھی نہیں۔ اس پر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ پندرہ دن کا دورہ تو طے شدہ پروگرام کے مطابق کروں گا۔ اس کے بعد مجھے سالانہ چھٹیوں کا ایک مہینہ ملتا ہے، وہ بھی اسی کام کی نذر کروں گا۔ میں یہ جانتا تھا کہ جس کام میں جی لگے اور خوشی حاصل ہو اسے چاہے دنیا کام کہے۔ مجھے تو اسی میں چھٹی کا لطف آتا ہے۔ تو یہ ہوا کہ کونے کھدروں میں جا کر بزرگوں کی کتابیں دیکھنے کا کام میں نے ڈیڑھ ماہ میں انجام دیا۔

میرے اس دورے کا بنیادی خیال یہ تھا کہ دیکھا جائے کہ برصغیر میں ہمارے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابیں کہاں کہاں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کس حال میں ہیں۔

اس کی تمہید پہلے باندھی جا چکی ہے کہ جب ہم نے برطانیہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو کی انیسویں صدی کی کتابوں کے بارے میں ایک سو چالیس پروگرام نشر کیے تو سننے والوں نے

بڑے دھیان سے سنے لیکن جب ہم نے کہا کہ بس، یہ سلسلہ یہیں ختم ہوتا ہے تو احتجاج اور شکایتوں کی ایک لہر آئی جس کی نمائندگی سامعین کا یہ ایک فقرہ کرتا ہے کہ ایک تو آپ ہماری کتابیں لے گئے اور اب انہیں پڑھ کر سنا رہے تھے، اسے بھی بند کر رہے ہیں۔

بی بی سی نے اس اعتراض کا جواب یوں دینا چاہا کہ بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابوں کے خود برصغیر کے اندر بھی بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ بس یہ ہے کہ یا تو عام لوگوں کو ان کی خبر نہیں یا پھر ان کتابوں تک رسائی آسان نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ گرد میں اٹی ہوئی قدیم اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں خاک کون چھانے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ میں دو طالب علم ملے جو اساتذہ کی شاعری کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہے تھے لیکن چند گھنٹوں کے فاصلے پر رام پور کی رضا لائبریری انہوں نے دیکھی بھی نہیں۔

خیر، اس طرح کے بہت سے قصے آگے آنے والے ہیں۔ میرے سفر کا نقشہ اردو سروس کے سربراہ ڈیوڈ پیج نے یوں تیار کیا کہ اسے دیکھیں تو لگتا ہے کہ میں انسان نہ تھا، گھن چکر تھا۔ ایک روز کراچی، ایک روز حیدرآباد، سندھ، ایک دن لاہور، ایک دن دلی، ایک دن رام پور، ایک دن لکھنؤ، ایک دن پٹنہ، ایک دن بھوپال اور ایک روز حیدرآباد دکن۔ البتہ انہوں نے یہ رعایت دے دی کہ بیچ میں ایک ایک دن کے لیے سفر چھوڑ دیا اور اس دوران مجھے نہ صرف ایک بھاری بھرکم موضوع پر تحقیق کرنی تھی بلکہ حیدرآباد سندھ اور پٹنہ، بہار میں اردو سروس کے سامعین کو ایک ایک ٹی پارٹی بھی دینی تھی۔ (حیدرآباد: 9 فروری 1982ء۔ پٹنہ 23 فروری 1982ء)

اس طرح کے دورے ڈیوٹی ٹور کہلاتے تھے۔ عملے کے مستعد افراد کو کبھی کبھار برصغیر کے دورے پر بھیجا جاتا تھا تاکہ جس خطے کے لیے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں اس کے بارے میں آگاہی رہے۔ ڈیوٹی ٹور پر جانے والے کے ذمے دو کام تھے۔ اول تو ایک دو مقامات پر سامعین کو ٹی پارٹی دے اور دوسرے یہ کہ مفید اور کارآمد لوگوں سے ملاقاتیں کرے اور واپس آ کر ایک رپورٹ لکھ دے اور بس۔ اس کے لیے تمام اخراجات ادا کر دیے جاتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ دورے پر جانے والوں کی بہت آرام سے گزرتی ہوگی۔ میں دس سال تک دیکھتا رہا، میرے سینئر اور با اختیار ساتھی ہر بار خود ہی ڈیوٹی ٹور پر چلے جاتے تھے۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔

دس سال بعد جن دنوں میرے دورے پر جانے کی باری آئی۔ اس وقت ڈیوڈ پیج شعبے کے سربراہ تھے۔ انہیں خود کام کرنے میں اتنا لطف آتا تھا کہ ایک بار دفتر ہی میں بستر ڈال لیا اور کئی

روز گھر بھی نہیں گئے۔ یوں سمجھئے کہ کام اور محنت کے معاملے میں بھوت تھے اور شاید دوسروں سے بھی یہی توقع کرتے تھے کہ ڈٹ کر کام کریں۔ اس لیے برصغیر کے طول و عرض میں مجھے دیوانوں کی طرح دوڑانا انہیں بالکل بھی عجیب نہیں لگا۔

میرا طیارہ کراچی میں کیا اترا، علم و حکمت کے سمندر میں اترا۔ اس کے بعد کے چھ ہفتے مجھے علم سمیٹتے گزرے۔ سب سے پہلا انٹرویو مشفق خواجہ کے ساتھ تھا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ ان سے صرف یہ پوچھنے کی دیر تھی کہ بزرگوں کی کتابوں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں؟ انہوں نے دفتر کے دفتر کھول کر رکھ دیے۔ خصوصاً کراچی اور اس کے نواح میں ان لوگوں کے بارے میں بتایا جو برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان سے اٹھ کر پاکستان آئے اور اپنے کتب خانے ساتھ لیتے آئے۔ پھر یہ کہ آزادی کے ابتدائی برسوں میں کتاب کا جو اعلیٰ ذوق تھا، وہ کام آیا اور لوگوں نے کتابیں نہ صرف جمع کیں بلکہ انہیں حفاظت سے رکھا اور مٹنے سے بچایا۔ یہی بات کچھ روز بعد اورنگ آباد میں اردو کے بزرگ شاعر اور دانشور سکندر علی وجد نے کہی کہ کتاب کے عشق کے بغیر کتاب محفوظ نہیں رہ سکتی۔

کراچی سے میں سندھ کے دوسرے بڑے شہر حیدر آباد پہنچا جہاں اردو سروس کے سامعین کے لیے ٹی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ شام میرے لیے عجیب تھی۔ میں جن لوگوں سے چار ہزار میل دور بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ آج وہ میرے سامنے موجود تھے اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ سامعین بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔

سندھ جیسے تاریخی صوبے میں پرانی کتابوں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں؟ یہ سوال لے کر میں انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی کے اس وقت کے سربراہ ڈاکٹر غلام علی الانہ کے پاس پہنچا اور وہ بھی اس شان سے کہ نہ تو انہیں اپنے آنے کی پہلے سے خبر کی اور نہ خبردار کیا کہ میں کتنا بڑا اور اہم سوال کرنے آ رہا ہوں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جو کام ہونے والے ہوتے ہیں، وہ خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ الانہ صاحب بڑے تپاک سے ملے اور بڑی خندہ پیشانی سے صوبہ سندھ کے ایک ایک گاؤں اور ایک ایک مکان کا احوال کہہ سنایا جہاں بزرگوں کی کتابیں محفوظ ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ جب میں لندن واپس آ گیا تو الانہ صاحب کا ایک مفصل خط آیا۔ اس میں انہوں نے ان کتب خانوں کی تفصیل لکھی تھی جن کا ذکر ملاقات کے دوران رہ گیا تھا۔

حیدرآباد کے بعد میں لاہور پہنچا۔ وہاں مجھے پنجاب پبلک لائبریری دیکھنے کا اشتیاق تھا جو انگریزوں نے سنہ 1884ء میں قائم کی تھی۔ اس عظیم کتب خانے کے قیام کے لیے اتنی ہی عظیم عمارت چنی گئی جو دراصل نواب وزیر خاں کی تعمیر کی ہوئی بارہ دری تھی۔ نواب صاحب شاہجہاں کے دور میں لاہور کے حاکم تھے۔ انگریزوں نے اس طرح کا ایک کتب خانہ پہلے کلکتے میں قائم کیا تھا۔ برصغیر کے ہر پبلشر کو یہ حکم تھا کہ جو کتاب بھی شائع کرے اس کا ایک ایک نسخہ لاہور اور کلکتے کے ان کتب خانوں کو ضرور بھیجے۔ یہی سبب تھا کہ میں بڑے شوق سے لاہور کی یہ لائبریری دیکھنے گیا۔ گیا تو پتا چلا کہ ہزاروں کتابیں گم شدہ ہیں۔ لوگ کتاب جاری کرا کے لے گئے اور کبھی واپس نہیں کی۔ چوری چکاری اس کے علاوہ تھی۔ مجھے وہاں لاہور کے تاریخی روزنامے "پیسہ اخبار" کی فائلیں دیکھنے کا غیر معمولی اشتیاق تھا اور سنا تھا کہ وہاں 1897ء سے 1948ء تک کے پیسہ اخبار کے فائل محفوظ ہیں مگر یوں نہ تھا۔ کتنے ہی فائل کم سے کم مجھے تو نہیں نظر آئے۔ ایک خبر ہے کہ پیسہ اخبار کے سارے شمارے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ اب رہ گئے دوسرے اخبار۔ انہیں فنڈ کی کمی اور موسم کے اثرات کی بھینٹ جلد ہی نگل جائے گی۔

میں نے پنجاب یونیورسٹی کا کتب خانہ دیکھا۔ دیال سنگھ لائبریری دیکھی جو امرتسر کے ایک گاؤں کے ایک باشندے کی یادگار ہے۔ اس نے علم کا علم اونچا کیا تھا۔ نیک نیتی کا اُسے یہ صلہ ملا کہ اُس کا نام آج تک زندہ ہے اور اس کا کتب خانہ وقت کے سیلابوں کی زد میں آنے کے باوجود آج بھی روشن مینار کی طرح کھڑا ہے۔

لاہور سے میں دلّی پہنچا۔ دلّی تو ایک سمندر ہے اور گوپی چند نارنگ اس کے درمیان ایک جزیرہ ہیں۔ علم سے تو بہت سارے محبت کرتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے علم محبت کرتا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہی حال ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے عاشق بھی بہت ہیں اور حاسد بھی بہت۔ دلی سے چونکہ مجھے ہندوستان کے وسیع علاقوں میں جانا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور گوپی چند نارنگ صاحب سے پوچھا کہ سرزمین ہند میں ہمارے بزرگوں کی کتابیں کہاں کہاں ہیں؟

بس میرا یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ انہوں نے ایک ایک کتب خانے کی ایسی تفصیل فراہم کر دی کہ ایک بار تو خیال ہوا کہ بس اب گھر چلیں۔ پھر بھی، سنا ہوا دیکھے ہوئے کی مانند پہلے کبھی ہوا ہے جواب ہوگا۔ یہ سوچ کر دہلی میں کتب خانے دیکھے۔ وہیں یہ خبر ملی کہ امروہے کا ایک

تاجر بھوپال سے دیوانِ غالب کا ایک نسخہ لایا ہے جو خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اپنی فہرست میں اسے بھی شامل کیا اور امروہے کی جانب چل پڑا۔ پتہ چلا کہ شہر کا پرانی کتابوں کا تاجر لکھ پتی ہونے کے خواب دیکھتا ہوا کہیں مدہوشی کے عالم میں ہے۔ البتہ وہ جو دیوانِ غالب کا نسخہ بھوپال سے لایا تھا، وہ نسخہ کسی طرح رام پور جا پہنچا ہے۔

لیجیے صاحب، میں بھی اس کے تعاقب میں رام پور جا پہنچا۔ وہی شاہی ریاست جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعر اور دانشور سکون اور صلے کی خاطر جاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ رام پور کا نام آرام پور پڑ گیا (کراچی کے آرام باغ کی طرح)

دنیا جانتی ہے اور اگر نہیں جانتی تو اب جان لے کہ اردو کتابوں کے دو سب سے بڑے اور تاریخی ذخیرے رام پور کی رضا لائبریری اور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہیں۔ رام پور کے کتب خانے کے نگراں مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب ہوا کرتے تھے۔ میری ان سے خط و کتابت بھی تھی مگر اس سے پہلے کہ میں اس سفر پر چلتا، وہ اس دنیائے فانی سے چل بسے۔ پھر بھی رام پور کی اس زیارت گاہ سے محروم رہنا مجھے منظور نہ تھا۔ میں شاہی محل کی عمارت میں واقع رضا لائبریری پہنچا۔ اس وقت اس کے نگراں عرشی صاحب کے بیٹے اکبر علی خاں عرشی زادہ تھے۔ وہی عرشی زادہ جنہوں نے بھوپال سے ملنے والے دیوانِ غالب کے قلمی نسخے کا عکس شائع کر دیا تھا جس کی قیمت اس زمانے میں تین ہزار روپے مقرر کی گئی۔ اس دوران اس نسخے کا ایک اور عکس جریدہ ''نقوش'' لاہور میں چھپ گیا۔ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی اور اس غریب نسخے پر آخری ستم یہ ہوا کہ لوگوں نے ثابت کر دیا کہ یہ نسخہ اصلی نہیں بلکہ کسی جعل ساز کا تیار کیا ہوا ہے۔

ادھر رضا لائبریری کا یہ حال تھا کہ اس کے فرش سے عرش تک قدیم کتابیں آراستہ تھیں۔ اتنا بڑا کتب خانہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں درجنوں محقق بیٹھے ان تاریخی نسخوں میں سر کھپا رہے ہوں گے۔ دیکھا تو صرف ایک تنہا یورپین خاتون بیٹھی مغل دور کی مصوری کا جائزہ لے رہی تھی۔ عرشی زادہ صاحب نے وہاں موجود عظیم کتابوں اور مصوری کے شاہکاروں کے بارے میں بتایا۔ مجھے اپنے گھر مہمان ٹھہرایا اور مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی اس سرائے فانی کو چھوڑ کر سدھارے۔

آباؤ اجداد کی کتابوں کی تلاش میں سرگرداں اب میں لکھنؤ پہنچا جہاں ہماری حسینہ باجی کے شوہر مسعود حسن رضوی مرحوم کا گھرانہ آباد ہے۔ ان کے بیٹے نیر مسعود رضوی نے لکھنؤ کے کتب

خانوں اور کتابوں کے ذخیروں کی نشاندہی کی۔ ان ہی کی نشاندہی پر میں قدیم کتابوں کے اتنے ہی قدیم اور بزرگ تاجر آغا نادر سے ملنے ان کی دکان پر پہنچا۔ ان غریب کا اور ان کے ذخیرے میں موجود کتابوں کا چل چلاؤ قریب تھا۔ انہیں دنیا سے جاتے ہوئے اس بات کا رنج تھا کہ ان کی اولاد کو نایاب کتابوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔

میرا اگلا پڑاؤ عظیم ریاست بہار کا عظیم دارالحکومت پٹنہ تھا جہاں اردو کے شجر پر ہزار ہا گل بوٹے کھلے تھے اور جہاں اردو، فارسی اور عربی کتابوں کا دوسرا بڑا ذخیرہ تھا۔ خدا بخش لائبریری کے نگران اُن دنوں عابد رضا بیدار تھے جنہوں نے مجھے دکھانے کے لیے اپنے کتب خانے کے سارے دروازے، تمام الماریاں اور وہ تجوری بھی کھول دی جس میں بے حد نادر و نایاب کتابیں اور تصویریں رکھی جاتی ہیں۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ ویسا جیتا جاگتا کتب خانہ میں نے برصغیر میں کہیں نہیں دیکھا۔ وہاں تحقیق، طباعت اور اشاعت کا ایسا کام ہو رہا تھا کہ جی خوش ہو گیا۔ مقامی اسکالر بھی محو تھے اور کسی غریب ملک کے اسکالر دینی معاملات کی چھان بین کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔

پٹنہ میں اردو سروس کے سامعین کی ٹی پارٹی بھی تھی۔ کیسے پیارے لوگ تھے اور کیسی چاہ سے ملے تھے۔ چائے خانے سے اٹھ کر سارے کے سارے میرے کمرے میں آ گئے اور پھر بڑی مشکل سے گئے۔ آخر میں یونیورسٹی کے اردو کے شعبے نے مجھے دعوت دی اور طالب علموں کے ساتھ علم و آگہی کی باتیں ہوئیں۔ شعر بھی پڑھے گئے اور لطیفے بھی کہے گئے۔

پٹنہ سے اڑان بھر کر میں بھوپال پہنچا۔ رام پور کی طرح بھوپال بھی کبھی مسلم ریاست تھا جہاں ادب کی اور کتاب کی قدر تھی۔ مجھے بھوپال کی قدر تھی کہ ہماری اردو سروس کے بلاشبہ سب سے بڑے قدرداں جناب جہاں قدر چغتائی بھوپال میں آباد تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور کتابوں کے ذخیروں کی زیارت کرائی۔ شہر کی مولانا آزاد لائبریری سرِ شام بند ہو رہی تھی۔ کہہ سن کر اسے دوبارہ کھلوایا اور میں وہاں دیر تک قدیم شہ پارے دیکھتا رہا۔ شاہانہ دور کی یہ کتابیں اسی زمانے کی الماریوں میں آراستہ تھیں۔ ان الماریوں کی لکڑی دکن سے تحفے کے طور پر آئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کبھی دیمک نہیں لگے گی۔ اس کتب خانے میں والیانِ ریاست کے ذاتی ذخیروں سے ملنے والی کتابیں بھی موجود تھیں۔ میں جن دنوں وہاں تھا، سنا تھا کہ حکام ریاستی دور کی اس شاندار سرخ عمارت میں لائبریری بند کر کے

پولیس کا دفتر کھولنے والے ہیں۔

سچ ہے، حکام ہر جگہ کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔

رام پور اور بھوپال کے بعد ابھی اور دو مسلم ریاستوں کا سفر باقی تھا۔ حیدرآباد دکن اور ٹونک۔

میرا حیدرآباد جانا کسی اعجاز سے کم نہ تھا۔ میں پہنچا تو معلوم ہوا کل ہند اردو کانفرنس ہو رہی ہے اور ملک بھر کے دانشور وہاں جمع ہیں۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو بے شمار کتب خانوں کی خبر ملی۔ جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ دیکھا جہاں کبھی اردو، فارسی، عربی اور دینی کتابوں کا جشن سا رہتا ہوگا۔ اب وہی راہداریاں سونی پڑی تھیں۔ اسی طرح سالار جنگ میوزیم لائبریری ہے۔ وہاں قرآن کے ایسے ایسے نسخے ہیں کہ دیکھا ہی کیجیے۔ وہیں کتب خانہ سعیدیہ ہے جو زیادہ تر بند رہتا ہے۔ اسی طرح ادارہ ادبیات کا کتب خانہ ہے جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے قائم کیا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر نظام دکن کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں جواہر پارے جمع ہیں مگر وہ سارے کے سارے نظام کی کنگ کوٹھی میں بند ہیں۔ پتا نہیں انہیں دیکھنا کس کے نصیب میں ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں۔

حیدرآباد میں چونکہ ہر گھر میں ایک اسلحہ خانہ اور ایک کتب خانہ ہوا کرتا تھا، اس لیے وہاں کمیاب کتابوں کی بہتات تھی اور میرے دورے کے وقت پرانی کتابوں کے کئی تاجر جو اگرچہ بوڑھے ہو چلے تھے مگر موجود تھے۔

سید محمد عبدالرزاق عرشی صاحب کا کتب خانہ، جسے دکان کہتے ہوئے جی دکھتا ہے، دکن کے کسی شہزادی کے مقبرے میں قائم تھا۔ عرشی صاحب نے عمر بھر کتابیں جمع کیں اور انہیں سنبھال کر رکھا۔ دوسرے تاجر علیم الدین صاحب تھے۔ وہ تو کتابوں کے پیچھے دیوانے تھے اور ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ وہی تھے جو دکن کے عظیم شاعر ملا غواصی کی کلیات کسی گاؤں سے ڈھونڈ کر لائے تھے۔ نہ لائے ہوتے تو دوسری متبرک کتابوں کی طرح وہ بھی نالے میں بہادی جاتی۔

مگر حیدرآباد کا جو حیرت انگیز کتب خانہ تھا، وہ شہر کے ایک موٹر مکینک محمد عبدالصمد خاں نے اپنے شوق سے قائم کیا تھا۔ جہاں کہیں پرانی کتابیں فروخت ہوتی تھیں، عبدالصمد خاں وہاں پہنچ جاتے تھے اور اس طرح ان کا کتابوں کا مینارہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹریٹ کرنے والے طالب علم اپنی تحقیق کے لیے ان کے کتب خانے میں کئی کئی مہینے گزارتے تھے مگر شہر

کے دانشور یہ کہہ کر ان کی تذلیل کیا کرتے تھے کہ وہ تو معمولی سے موٹر مکینک ہیں۔

جس طرح خدا اپنے محبوب بندوں کو اٹھا لیا کرتا ہے، حاسدوں کا یہ حال دیکھ کر انہوں نے اس کتب خانے کو بھی اٹھا لیا۔

میں نے کسی اردو اخبار میں پڑھا کہ راجستھان کے دور دراز مقام ٹونک میں علوم شرقیہ کا کوئی تحقیقی ادارہ ہے جو تصوف کے موضوع پر کل ہند مذاکرہ کرا رہا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی میں نے رختِ سفر باندھا اور ٹونک جانے والی ریل گاڑی کی تلاش میں نکلا۔ پتا چلا کہ وہاں ریل گاڑی نہیں جاتی۔ اب میں بسوں میں بیٹھ کر جے پور گیا اور وہاں سے ایک کار لے کر بھاگم بھاگ ٹونک پہنچا۔

معلوم ہوا کہ اجلاس ختم ہو چکا ہے اور ملک بھر سے آئے ہوئے دانشور جا چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں تھکا ہارا مسافر خود کو کسی کرسی پر گرا دیتا، خبر ملی کہ اردو، فارسی اور عربی کتابوں کا جیسا ذخیرہ ٹونک میں محفوظ ہے، ویسا کہیں اور نہیں ہوگا۔

اب تو ایسا محسوس ہوا کہ چھ ہزار نادر اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ ٹونک کا عربک اینڈ پرشین، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میرے لیے بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے نگران صاحبزادہ شوکت علی خاں نے ریڈیو پر سُن رکھا تھا کہ میں قدیم کتابوں کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ اب جو ملے تو یوں لگا کہ نذر باغ کی چبوترے والی کوٹھی میرے استقبال کو آراستہ تھی۔

اس روز میں نے حیرت انگیز کتابوں کی زیارت کی اور آنکھوں کے راستے علم نہیں تو اس کا جاہ و جلال اپنی روح میں اتارا۔

ٹونک کے اس کتب خانے میں ایک اور خزانہ محفوظ ہے۔ جب یہ علاقہ مسلم ریاست تھا اور اس میں شرعی عدالتیں قائم تھیں، ان عدالتوں کا سارا ریکارڈ بستوں میں بندھا یہاں کچھ اس طرح محفوظ ہے جیسے شہر کے قاضی ابھی ابھی عدالت سے اٹھے ہیں اور سائلین کو دلی اطمینان ہے کہ ان کی دستاویزات احتیاط سے رکھی گئی ہیں۔

یہ برصغیر کا آخری کونہ تھا جو میں نے دیکھا۔ کمال یہ ہوا کہ اس سفر کے دوران اتنے باکمال، اہل علم خواتین اور حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے پوری سرزمین پر بکھرے ہوئے کتابوں کے ذخیروں اور نایاب نسخوں کے بارے میں مجھے اتنی معلومات فراہم کیں کہ تکمیل کا ایسا احساس زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جو ہونے والے کام ہوتے ہیں، وہ خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں اتنا اضافہ اور کردوں کہ اس سارے عمل کے دوران یہ محسوس ہوئے چلا جاتا ہے کہیں کسی نے میری انگلی تھام رکھی ہے۔

تو اس طرح کتب خانہ مکمل ہوا۔ میں جو مواد لے کر آیا تھا۔ اس کی بنیاد پر دستاویزی پروگرام نشر کرنا شروع کیا۔ اس پر تین طرح کے خطوط آئے۔ اول تو تعریف وتوصیف کے خط۔ دوسرے میری معلومات میں اضافہ کرنے والے خط۔ جو کتب خانے میں تصور میں بھی نہ تھے، لوگوں نے ان کے بارے میں دلچسپ تفصیلات بھیجیں۔ تیسرے خط وہ تھے جن میں شکایت تھی کہ آپ ہمارے شہر میں نہیں آئے یا ہماری لائبریری میں نہیں آئے۔ یہ شکایت بجا تھی مگر اس کا جواب سادہ اور آسان تھا۔ میرے دورے کا مقصد برصغیر کے تمام کتب خانوں کی مکمل فہرست ترتیب دینا نہیں تھا۔ میں چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا تھا کہ برصغیر میں ہمارے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابوں کی قدر اور نگہداشت ہو رہی ہے یا نہیں۔

نتیجہ صاف تھا۔ کہیں تو قدر ہو رہی تھی اور کہیں بے قدری۔ کہیں کہیں تو کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے کباڑیوں کو بلا بلا کر ان کے حوالے کر دیے گئے۔ کہیں انہیں دیمک کھا گئی اور کہیں موسم انہیں برباد کر گیا۔ اکثر مقامات پر نئی نسل نے اپنے بزرگوں کی اس امانت کو تباہ ہو جانے دیا۔ کہیں احترام کے خیال سے یہ کتابیں دریا میں بہا دی گئیں۔ کنوؤں میں ڈال دی گئیں اور کہیں دفن کر دی گئیں۔

کچھ بھی ہو، پروگرام مقبول ہوا۔ بہت سے لوگوں نے خط لکھ کر پوچھا کہ قدیم کتابوں کی حفاظت کیسے کریں۔ اکثر لوگوں نے کتابوں میں نیم کے پتے رکھ دیے۔ نہ رکھے ہوتے تو شاید کتاب زیادہ عرصے سلامت رہ جاتی۔

پروگرام نشر ہونے کے بعد مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ احباب کی ایک محفل میں اس کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ بہت دلچسپ تحقیق ہوئی ہے اور نشر ہو کر فضا میں تحلیل ہو چکی ہے۔ اگر اسے کتاب کی شکل دے دی جائے تو کتنا اچھا ہو مگر وہ ناشر کہاں سے لایا جائے جو اسے خوشی خوشی چھاپ دے۔

میرا یہ کہنا تھا کہ وہیں موجود اسماعیل سعد صاحب نے کہا: لائیے کتاب کا مسودہ مجھے دیجیے۔ ابھی چھاپے دیتا ہوں۔ یہ بھی ہونے والا کام تھا، جھٹ ہو گیا۔ اردو کے بڑے دانشور

پروفیسر رالف رسل سے درخواست کی کہ وہ کتاب کا دیباچہ لکھ دیں۔ پہلے تو انہوں نے تامل کیا لیکن کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد رضامند ہو گئے خود اپنے ہاتھ سے دو صفحوں کا دیباچہ لکھا۔ میرا خیال تھا کہ تعریف کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ذرا مبالغے سے کام لیا ہے، میں نے اس کے دو جملے حذف کر دیے۔ بعد میں رالف رسل نے خفگی کا اظہار کیا اور میں شرم سے پانی پانی ہو گیا مگر ہوا یہ کہ دیکھتے دیکھتے کتاب تیار ہوئی اور بازار میں آ گئی۔

بعد میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اس کی اشاعت کے حقوق لے لیے۔ اب "کتب خانہ" کے نام سے یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان میں بھی دستیاب ہے جہاں ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ نے اسے شائع کیا ہے۔

تو یہ تھا میرے برصغیر کے پہلے سفر کا احوال۔

ابھی مزید تین سفر باقی ہیں۔

---------O---------

mooblib.org

آتے جاتے ساتھی

جس روز میں نے بی بی سی میں قدم رکھا، اتوار کا دن تھا۔ عملے کے تمام بڑے لوگ چھٹی پر تھے اور چھوٹے لوگ پروگرام پیش کر رہے تھے۔ چکوال کے اکرم منہاس پروگراموں کے بیچ میں اعلانات کر رہے تھے اور پٹنہ کے سید حسن خبریں پڑھ رہے تھے۔

ان دنوں لاجواب لوگ بی بی سی سے وابستہ تھے۔ اطہر علی، وقار احمد، ضمیر الدین احمد، تقی احمد سید، وسیم صدیقی، راشد اشرف، راشد الغفور اور یونس واسطی یہ سب اعلیٰ پائے کے براڈکاسٹر تھے۔ عملے میں ایک شخص ریڈیو پاکستان کا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ حسن ذکی کاظمی اور بدر عالم مرحوم میری شرکت سے پہلے اپنی میعاد پوری کر کے جا چکے تھے لیکن جانے والوں میں ایک قابلِ ذکر نام مختار زمن کا تھا۔ جب میں آیا، وہ جا رہے تھے اور ان کا جانا عام لوگوں کے جانے سے مختلف تھا۔

اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہاں اپنے سرکردہ ساتھیوں کا حال کہتا چلوں۔ ہمارے ساتھیوں میں سب سے سینئر یاور عباس تھے۔ یاور عباس کبھی فوج میں تھے اور دوسری عالمی جنگ میں محاذ کی فلمیں بناتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستانی فوج سے وابستہ ہوئے اور قائداعظم کی اس تاریخی تقریر کی فلم بندی کی جسے بعد میں بانیٔ پاکستان کی تقریروں کے مجموعے سے نکالنے کی کوشش کی گئی اور جس کی بلیک اینڈ وہائٹ فلم کے بارے میں یقین ہے کہ غائب کر دی گئی۔ اسی تقریر میں جناح صاحب نے کہا تھا کہ آج کے بعد کوئی ہندو ہندو نہیں اور کوئی مسلمان مسلمان نہیں رہے گا۔ سب مل کر اور پاکستانی بن کر رہیں گے۔

یاور عباس کسی مرحلے پر پاکستان چھوڑ کر لندن آ گئے۔ اس وقت بی بی سی کو اردو براڈکاسٹروں کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ اردو سروس سے وابستہ ہو گئے اور ابھی 88 یا 89 سال کی عمر تک وابستہ تھے۔ اس کے بعد حالات بدل گئے اور اردو کے شعبے سے تمام بزرگ فارغ کر دیے گئے۔

یاور عباس نے شروع ہی سے اپنی دھاک جمائی اور اس قدیم زمانے میں انگریزی کے تمام بڑے ڈرامے اردو میں ڈھال کر پیش کیے۔ ان میں شیکسپیئر کے ڈرامے خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ چند ایک ڈراموں میں بابائے ریڈیو ذوالفقار علی بخاری مرحوم کی آواز بھی شامل تھی۔ میرے ہوتے ہوئے یاور عباس نے دو قابلِ ذکر پروگرام پیش کیے۔ ان میں سے ایک کا عنوان تھا: ''اردو کے یورپین شاعر'' اور دوسرا دنیا کی تاریخی تقریروں سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس میں تمام تر صداکاری سعید جعفری نے کی تھی جو اپنی اداکاری کی تربیت کی بنا پر آواز کو کرداروں کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

دوسرے سینئر ساتھیوں میں تقی احمد سید تھے۔ وہ بھی اردو سروس کے پرانے رفقا میں سے ایک تھے۔ حالاتِ حاضرہ کے پروگرام پیش کیا کرتے تھے اور وہ جو وضعدار لوگ ہوا کرتے تھے، ان کی جیتی جاگتی مثال تھے۔

ان کے بعد اطہر علی اور وقار احمد تھے۔ جب میں سنہ 1957ء میں کراچی کے روزنامہ جنگ کے شعبہ اشتہارات سے وابستہ ہوا، اطہر علی اخبار کے مقامی نامہ نگار تھے جسے اسٹاف رپورٹر کہا جاتا تھا۔ اطہر علی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے، بہت ذہین اور ہنر مند تھے۔ میں نے بی اے کے کورس میں ان کی ترجمہ کی ہوئی معاشیات کی کتاب پڑھی تھی۔

صحافت کا انہیں غیر معمولی تجربہ تھا۔ اور پاکستان کے ایک بڑے روزنامے سے تعلق کی وجہ سے ان کی بے شمار لوگوں سے واقفیت تھی۔ ریڈیو سے حالاتِ حاضرہ کے پروگرام پیش کیا کرتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے موقع پر ان کے پیش کیے ہوئے پروگرام کو بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے پاکستان کے حالات پر کوئی پروگرام نشر کیا۔ ان دنوں ضیاء الحق فوجی حاکم تھے۔ ذرا ہی دیر بعد ضیاء الحق کا راولپنڈی سے ٹیلی فون آیا اور انہوں نے اطہر صاحب کو مبارکباد دی۔ آخری دنوں میں وہ اردو سیکشن کے سربراہ ہو گئے تھے۔ ان سے پہلے یہ اعزاز صرف سفید فام حضرات کے لیے مخصوص تھا۔ اطہر صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ان کے انتقال پر روزنامہ جنگ کے بزرگ ایڈیٹر سید محمد تقی نے کہا تھا کہ اطہر کی موت پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ یہ تو ہم لوگوں کے مرنے کے دن ہیں۔ اطہر صاحب کے دوستوں کا بڑا حلقہ تھا اور عجب اتفاق ہے کہ دو ایک کے سوا اس حلقے کے سارے احباب رختِ سفر باندھ چکے ہیں۔

وقار احمد بھی ہمارے سینئر ساتھی تھے (اور اب تک ہیں) ابتداء میں وہ کراچی یونیورسٹی

کے استاد تھے۔ اس سے پہلے لندن میں تعلیم پا چکے تھے۔ کسی مرحلے پر وہ بی بی سی سے وابستہ ہوئے اور عرصہ دراز تک حالات حاضرہ کا پروگرام سیربین پیش کرتے رہے۔ انہوں نے ایک بڑا وزنی پروگرام ترتیب دیا تھا جس کے لیے پاکستان جا کر انہوں نے سارے ہی بڑے سیاستدانوں کے انٹرویو لیے تھے۔

اس شعبے میں آنے والے ایک اور کہنہ مشق صحافی ضمیر الدین احمد تھے۔ ان کا تعلق اگرچہ انگریزی اخبار ڈان سے تھا لیکن نہایت اعلیٰ اردو تحریریں لکھتے تھے۔ خصوصاً ان کے افسانے آج بھی گفتگو کا موضوع بنتے ہیں۔ بہت اچھے براڈکاسٹر تھے لیکن طبیعت بلا کی جلالی تھی۔ بش ہاؤس میں گنتی کے لوگوں کو دوست بنا سکے اور کنٹریکٹ مکمل ہونے پر خاموشی سے چلے گئے۔ بعد میں انہوں نے واشنگٹن میں وائس آف امریکہ میں ملازمت کر لی لیکن مقام کی تبدیلی اور خصوصاً ساتھیوں کی تبدیلی بھی ان کی ترش روئی دور نہ کر سکی۔ بالآخر چل بسے۔

میرے ساتھیوں میں وسیم صدیقی بھی تھے جو کل وقتی براڈکاسٹر تھے۔ ضمیر الدین احمد کے برعکس نہایت شگفتہ مزاج پایا تھا۔ لطیفہ گوئی میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ سائنس کا پروگرام ہو یا خواتین کا، وہ سب میں دلچسپی کے رنگ گھول دیتے تھے۔ جس پروگرام کی وجہ سے وہ یاد رکھے جائیں گے وہ بچوں کا پروگرام شاہین کلب تھا جس کا مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وسیم صدیقی ریڈیائی ڈرامے پیش کرنے کے ماہر تھے۔ اس قسم کے تجربے وہ لندن آنے سے پہلے پاکستان میں کر چکے تھے جہاں سے وہ وائس آف امریکہ کے لیے بھی پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے۔ ان کے پیش کیے ہوئے کئی ڈرامے عرصے تک یاد رکھے گئے۔ جن دنوں یہ تحریر لکھ رہا ہوں صحت ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کر رہی ہے۔

میرے پرانے ساتھیوں میں راشد اشرف اور راشد الغفور بھی تھے۔ دونوں میں ایسی رفاقت تھی کہ بھائی بھائی لگتے تھے۔ پھر کسی مرحلے پر راشد الغفور، راشد اشرف کے دولہا بھائی بن گئے۔ راشد اشرف لندن آنے سے پہلے لاہور میں برطانوی سفارتخانے سے وابستہ تھے اور میرے دوست فرہاد زیدی کے رفیق کار تھے۔ راشد الغفور کا تعلق پرانی دلی کے خیری گھرانے سے تھا جس کی وضع قطع ان میں فطری طور پر سرایت کیے ہوئے تھی۔ بی بی سی سے ریٹائر ہو کر دونوں نے کاروبار کی دنیا میں قدم رکھا۔ البتہ دنیا سے اٹھنے میں راشد الغفور نے عجلت دکھائی۔ حق مغفرت کرے۔

بعد میں آصف جیلانی بھی عملے میں شریک ہوئے۔ وہ اخبار جنگ کے لندن ایڈیشن کے ایڈیٹر تھے لیکن بی بی سی سے ان کے مراسم پرانے تھے جن کی انہوں نے تجدید کی اور کامیاب اور مقبول براڈکاسٹر ثابت ہوئے۔ جن دنوں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا اور وسطی ایشیا میں اس کی ریاستیں خودمختار ہوئیں اور بحران میں مبتلا بھی ہوئیں۔ میں اردو سروس کا قائم مقام سربراہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ شعبے کے بجٹ میں کچھ رقم بچ گئی ہے۔ اس کا کوئی مصرف نکالو۔ میں نے تجویز پیش کی کہ آصف جیلانی کو سابق سوویت جمہوریاؤں کے دورے پر بھیجا جائے اور وہ ایک دستاویزی پروگرام ترتیب دیں۔ تجویز مان لی گئی۔ وہ قزاقستان، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ کے دورے پر گئے اور بہت سا مواد لے کر آئے۔ ان کا پروگرام نشر ہوا جسے انہوں نے کتاب کی شکل بھی دی جو سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی۔ اس کے علاوہ آصف جیلانی برصغیر کے دورے پر بھی گئے اور شہرِ بے کراں کے نام سے مختلف شہروں کے بارے میں پروگرام نشر کیا۔ حالاتِ حاضرہ سے ان کی پرانی وابستگی ان کے لیے گراں قدر تجربہ تھی جو آج تک ان کے کام آ رہی ہے۔

اس دوران انعام عزیز، محمد غیور، شاہد ملک، طاہر مرزا، انور خالد، عارف وقار، عبید صدیقی، وسعت اللہ خاں، علی احمد خاں، حسن ذکی کاظمی، ہارون جعفری اور حسیب احمد خاں بھی بی بی سی سے وابستہ ہوئے۔ اس کے عملے میں کبھی کوئی خاتون شامل نہیں تھیں، سارہ نقوی نے پہلی خاتون نیوز ریڈر ہونے کا اعزاز پایا۔ انہوں نے عرصے تک خواتین اور سائنس کا پروگرام پیش کیا۔ اسی بنا پر انہیں خلائی سائنس اور ٹیکنالوجی پر پروگرام ترتیب دینے کے لیے دنیا کی کئی بڑی خلائی رسدگاہوں کے دورے پر بھیجا گیا۔ واپس آ کر انہوں نے بھاری بھرکم پروگرام ترتیب دیا جسے اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان نے شائع کیا۔ ان کے بعد ثریا شہاب، ماہ پارہ صفدر اور نعیمہ احمد مہجور اور ارجمند واجد نے بش ہاؤس میں قدم رکھا اور خبریں پڑھنے والی خواتین کی بہتات ہو گئی۔ دلی ریڈیو سے ثریا سعید بھی آئی تھیں لیکن اسی ریڈیو سے نہایت باصلاحیت براڈکاسٹر مجیب صدیقی آئے اور نام پایا۔ وہ بھی ڈرامے کے آدمی تھے۔ انہوں نے بی بی سی ٹیلی ویژن کے نہایت مقبول ڈرامے "یس منسٹر" کو اردو کے قالب میں ڈھال کر بڑی چابکدستی سے پیش کیا۔ ان ہی دنوں دورِ حاضر کے سب سے بڑے قوال نصرت فتح علی خاں افق پر ابھرے ہی تھے۔ مجیب صدیقی نے انہیں سنتے ہی کہا کہ یہ شخص بڑا قوال بنے گا۔ چنانچہ خاں صاحب کو بی بی سی کے بڑے ہال میں مدعو کر کے ان کی قوالی ریکارڈ اور نشر کی گئی۔ اس کے بعد نصرت فتح علی خاں نے اور ان کی تانوں نے

دیکھتے دیکھتے آسمان کو چھولیا۔

جو احباب عملے میں شامل نہیں تھے مگر پروگراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتے تھے، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں منصور معجز، شمیم بشر، نعمان الحق، طلعت حسین، سید حسن اور اکرم منہاس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ہی کی طرح پروین مرزا، سحاب قزلباش، دردانہ انصاری اور شاہدہ احمد کے بغیر یہ فہرست نامکمل رہے گی۔ یہ سب اپنا اپنا نقش چھوڑ کر گئے۔

آخر میں اپنے جس ساتھی کا ذکر لازمی ہے، وہ ہیں شفیع نقی جامعی، جامعہ ملیہ علیگڑھ اور جامعہ کراچی سے ان کا تعلق اتنا گہرا رہا کہ وہ خود بھی جامعی کہلائے۔ جب وہ کراچی چھوڑ کر لندن آرہے تھے تو کسی اخبار نے لکھا کہ شہر کا سب سے ذہین اور زیرک طالب علم پردیس جارہا ہے۔ شفیع نے بش ہاؤس آکر اردو شعبے کے سربراہ ڈیوڈ پیج سے ملاقات کی اور اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ ڈیوڈ اُن کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ ان کو کوئی کام دو۔ میں ان دنوں بچوں کا پروگرام شاہین کلب پیش کر رہا تھا جس میں "دادا کی کتابیں" کے عنوان سے ہم سو برس پرانی بچوں کی کتابیں پڑھ کر سناتے تھے۔ وہ ایک صدی پرانا آموختہ سنانے کا کام میں نے شفیع کو سونپا۔ اس کے بعد انہوں نے شعبے میں اپنا مقام بنالیا۔ ساتھ ہی وہ لندن میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے جس کے لیے روزی کی ضرورت تھی۔ بچوں کے پروگرام سے ضرورت بھر کی آمدنی مشکل تھی۔ اس اثنا میں شفیع نے ہندی سروس والوں سے بھی مراسم بڑھائے اور ان کے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر عام اور معمولی نہیں بلکہ بہت گاڑھی ہندی سیکھ لی۔ شہر کے سب سے ذہین طالب علم کا یہ کوئی واحد کارنامہ نہ تھا۔ شفیع نقی جامعی نے کتنی دولت کمائی، یہ کہنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہاتھ لگا اسے انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

گئے وقتوں کی یادگار کے طور پر وہ اب بھی اردو سروس سے وابستہ ہیں اور وہ بھی اس شان سے کہ ان کی توانائی میں جو ذراسی بھی کمی آئی ہو۔

پھر ایک مرحلے پر کراچی کے انگریزی اخبار "دی نیوز" سے عباس ناصر عام براڈ کاسٹر کی حیثیت سے آئے۔ وہ بلا کی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انگریزی زبان پر غضب کی گرفت تھی اور حکام بالا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی غیر معمولی جرأت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ترقی کا زینہ جو چڑھنا شروع کیا تو دیکھتے دیکھتے پورے جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی نشریات کے سربراہ مقرر ہوئے اور ابھی انہیں اور اوپر جانا تھا کہ خدا جانے کیا ہوا؟ یہ راز نہ

انہوں نے کھولا نہ ہم نے پوچھا۔ وہ بی بی سی کی ملازمت چھوڑ کر واپس پاکستان چلے گئے اور انگریزی روزنامہ "ڈان" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

بی بی سی کی ملازمت کی عجیب بات تھی کہ بہت کم لوگ اسے چھوڑ کر جاتے تھے اور اگر جاتے بھی تو یہیں برطانیہ میں رہ پڑتے تھے۔ بغاوت کر کے جانے والوں میں مجھے بنگلہ سروس کے ایک نوجوان کا علم ہے جو یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ مجھے برطانیہ کا کھانا سخت ناپسند ہے۔

اب میں آتا ہوں اردو سروس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانش ور کارکن مختار زمن کی جانب جو میرے لندن آنے سے ذرا قبل 1972ء میں بی بی سی کو خیر باد (میں زیادہ سخت لفظ سے عمداً گریز کر رہا ہوں) کہہ کر چلے گئے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، پاکستان کے سیاسی بحران اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت اس عمارت میں جو بش ہاؤس کے نام سے مشہور ہے، سخت کشیدگی تھی۔ اس تصادم میں اردو شعبہ ایک طرف تھا اور ہندی اور بنگلہ شعبوں کے چند افراد دوسری طرف تھے۔ میرے ساتھی مجھے بتاتے ہیں کہ بارہا سخت کلامی ہوئی اور معاملہ بگڑتے بگڑتے بچا۔ ایک بار محمد علی شاہ مرحوم (سدھو بھائی) پر برہمی طاری ہوئی اور بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا گیا۔

مجھے پتا نہیں اس وقت مختار زمن کا رویہ کیسا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک روز اردو نشریات میں انہوں نے بھارت کا طیارہ اغوا کرنے والوں کو حریت پسند یا شاید مجاہدین آزادی کہہ دیا۔ کہتے ہیں کہ اس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مختار زمن کے نام سرکاری چٹھی آئی جس میں ان سے وضاحت طلب کر لی گئی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ مختار زمن اپنے ٹائپ رائٹر پر بیٹھے اور اس چٹھی کا جو جواب لکھا، وہ خاموشی سے پڑھ لیا گیا اور کسی کو دکھایا نہیں گیا۔ مختار زمن نے اپنا سامان باندھا اور چلے گئے۔

اس قصے کو میں یہیں ختم کرتا ہوں۔

----------O----------

شاہراہ اعظم، قدم بہ قدم

ایک روز ڈیوڈ پیج نے مجھ سے پوچھا "رضا! تمہیں شیر شاہ سوری یاد ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

انہوں نے پوچھا "کیوں؟"

میں نے کہا "اس نے پشاور سے کلکتے تک ایک سڑک بنوائی تھی، جرنیلی سڑک۔"

بس۔ اس طرح اپنی تعمیر کے پونے پانچ سو سال بعد اس تاریخی شاہراہ کا ذکر اس شان سے چھڑا کہ ایک عالمی نشریاتی ادارے نے فیصلہ کیا کہ اس عظیم سڑک کے موضوع پر ایک دستاویزی پروگرام تیار کر کے نشر کیا جائے۔

میں نے کہا "مگر اس پر تو بہت روپیہ خرچ ہوگا۔"

جواب ملا "روپیہ ایجاد کرنے والے بادشاہ کے نام پر اتنا تو ضرور ہونا چاہیے۔"

یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ دو ہفتے سرکاری اور چار ہفتے ذاتی لگا کر میں نے کتب خانہ کے نام سے جو دستاویز تیار کی تھی اس کے بارے میں اردو سروس کے اس وقت کے سربراہ ڈیوڈ پیج کا خیال تھا کہ اگر اس کا انگریزی ترجمہ کر کے کسی یونیورسٹی میں جمع کرا دوں تو مجھے پی ایچ ڈی کی سند مل جائے گی۔

اس دن میں بہت محظوظ ہوا۔ جب مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ 1945ء کی بات ہے جب تاریخ کے مضمون میں شیر شاہ کا ذکر پڑھا تھا۔ پورے چالیس سال پہلے پڑھا ہوا سبق۔ بس اتنا ہی یاد تھا۔ اس شام میں لپک کر گھر آیا۔ اپنے کتب خانے سے رام آشرے شرما کی کتاب "شیر شاہ اور اس کا عہد" نکالی اور سات سو صفحوں کی کتاب تین دن میں پڑھ ڈالی۔ غرض یہ کہ میرا ہوم ورک شروع ہو گیا۔ اب پتا چلا کہ وہ سڑک پشاور سے کلکتے تک نہیں بلکہ اٹک کے قریب دریائے سندھ کے کنارے چھوٹے سے قصبے باغ نیلاب سے شروع ہو کر مشرقی بنگال کے ساحلی شہر سنار گاؤں

تک جاتی تھی اور اس کا معمار صرف پانچ سال حکمرانی کرنے کے بعد 22 مئی 1545ء کو بارود کے حادثاتی دھماکے کی زد میں آ کر مر گیا تھا۔ اس زمانے میں دھماکے جنت میں جانے کے لیے نہیں کیے جاتے تھے۔ کچھ عرصے اور جیتا رہتا تو اسی سرزمین کو فردوس بنا دیتا۔

میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ وہ تیاری کیا تھی؟ پشاور سے کلکتے تک راہ میں پڑنے والے تمام شہروں میں ہمارے جو عزیز سامعین آباد تھے اپنی فہرستوں میں سے ان کے نام ٹھکانے چن چن کر نکالنے تھے۔ اس کا سبب سیدھا سادہ تھا۔

آپ کہیں جائیں اور وہاں کوئی مقامی رہبر نہ ہو تو آپ کا کام دوگنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں، کس سے ملنا ہے اور کس سے نہیں۔ یہ گُر کی باتیں اسی مقام اور اسی علاقے کا واقف کار ہی بتا سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ یہ کام کتابوں اور نقشوں کی مدد سے کرلے تو وہ عمر بھر سر ہی کھپاتا رہ جائے۔

میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب تھا۔ برصغیر کے جس علاقے کا سفر مجھے طے کرنا تھا وہاں سے بے شمار سامعین مجھے خط لکھا کرتے تھے اور ان کا اصرار ہوا کرتا تھا کہ میں ان کے علاقے کا سفر کروں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ان سب کو خط لکھے۔ وہ سب میری انگلی تھامنے پر رضامند ہو گئے۔ بس یوں سمجھئے کہ پانی پت میں ایک غیر مسلم بزرگ میری مدد کو آئے اور سہسرام میں تو یہ حال تھا کہ میں جہاں بھی جاتا تھا اور آٹھ دس نوجوانوں کی ایک ٹولی میرے ساتھ چلا کرتی تھی۔ مجھے جو مدد ملی اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہر جگہ لوگ پوچھا کرتے تھے کہ آپ اتنے بڑے مشن پر نکلے ہیں۔ آپ کی ٹیم کے باقی لوگ کہاں ہیں؟

بس صرف ایک تاج محل تھا جہاں میں اپنی تنہائی کے ساتھ گیا تھا۔ جرنیلی سڑک کے سفر کے لیے مجھے ایک ماہ کا عرصہ دیا گیا اور اشارتاً یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر زیادہ وقت لگے تو لگا لینا۔ دوسری بات یہ کہ کہاں کہاں جانا ہے اور کہاں کتنا وقت گزارنا ہے۔ اس کا مکمل اختیار مجھے دے دیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سفر کے اخراجات کے لیے کافی بڑی رقم میرے حوالے کر دی گئی۔ اتنی بڑی کہ جب میں کراچی کے ہوائی اڈے پر طیارے کی طرف جانے کے لیے مسافروں کی قطار میں کھڑا تھا اور کسی سرکاری ادارے کے اہلکار مختلف مسافروں کو ایک کیبن میں لے جا کر ان سے پوچھ گچھ کر رہے تھے، ان کی نگاہ مجھ پر بھی پڑی۔ مجھے بھی طلب کر لیا گیا۔ مجھ سے پہلے جس سیدھے اور بھولے بھالے سے مسافر کو پکڑا گیا، اس کے جوتے اور موزے اتروائے گئے جہاں

اس غریب نے تھوڑی سی غیر ملکی کرنسی چھپائی ہوئی تھی۔

اس کے بعد میری باری تھی۔ نہایت تحکمانہ لہجے میں پوچھا گیا "آپ کے پاس کتنی غیر ملکی کرنسی ہے؟"

میں نے بغداد کے ایک بزرگ کی طرح سچ سچ بتادیا "ایک ہزار پاؤنڈ۔"

افسر نے یہ سوچتے ہوئے کہ بڑا شکار ہاتھ لگا ہے، مجھ سے کہا "اپنا پاسپورٹ دکھائیے۔"

میں نے پاسپورٹ دکھایا۔

افسر نے اس میں لکھا ہوا میرا نام پڑھا۔ اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور اعلان کر کے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتایا "لو بھئی۔ بی بی سی لندن کے عابدی صاحب آئے ہیں۔" اور اس سے پہلے کہ کھانے پر میری ضیافت کی جاتی، میں نے رخصت چاہی اور دوتی کی پرواز میں بیٹھ گیا۔

یہاں میں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ اگرچہ مجھے پشاور سے کلکتے تک کا سفر کرنا تھا مگر یہ سفر یوں نہیں کیا گیا۔ 1985ء کے موسم گرما کی آمد تھی اور اگر میں پہلے پاکستان کا علاقہ طے کرتا تو بھارت کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے گرمی اپنے شباب پر ہوتی، پنجاب، ہریانہ، یوپی، بہار اور بنگال کے علاقے تنور بنے ہوتے اور نہ صرف میرا سفر بلکہ میری صحت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ میرے دوستوں نے بھی مشورہ دیا کہ بھارتی علاقے کا سفر پہلے کر آؤ۔ پاکستان تو پھر اپنا گھر ہے اور یہاں سہولتیں زیادہ ہیں، بھارت سے واپس آ کر اس علاقے کو دیکھ لینا۔

مشورہ نیک تھا۔ حرف بہ حرف صحیح نکلا اور میں چھوٹی سی اڑان بھر کر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا اترا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ بھی میری کہانی کے مرکزی کردار شیر شاہ سوری کا تھا اور وہ علاقہ بھی شیر شاہ سوری کا تھا۔ میں اُڑا تو اس کا رہتاس کا قلعہ دور ہوتا گیا اور سہسرام کا مقبرہ قریب آتا گیا جو علاقہ میں چھوڑ رہا تھا اس میں اس کی بنائی ہوئی سڑک کا نام جی ٹی روڈ تھا۔ جس سرزمین پر میں اترنے والا تھا وہاں اس کی سڑک کا نام شیر شاہ سوری مارگ تھا۔

"وہ جو ہم سے آگے آگے چل رہے تھے، کیا ان کی قدریوں کی جاتی ہے۔" میں نے خود سے پوچھا۔

"ہاں، وہ جو ہم سے آگے آگے چل کر ہمارے لیے راستے ہموار کرتے گئے تھے، ان

کی قدر یوں ہی کی جاتی ہے۔'' جواب ملا۔

''ایک نظر نہ آنے والی لکیر کیا روپے کا بٹوارہ بھی کر دیتی ہے؟'' میں نے خود سے نہیں پوچھا۔ جواب مجھے معلوم تھا۔

دلّی پہنچ کر اصولاً مجھے امرتسر جانا چاہیے تھا۔ یہ سڑک وہیں سے بھارت میں داخل ہوتی ہے لیکن ایک سال پہلے وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل ہو چکا تھا۔ قتل اگر چہ دلّی میں ہوا لیکن قاتل پنجاب کے تھے اس لیے حکومت ہند نے ریاست پنجاب میں غیر ملکیوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ پنجاب جیسے علاقے کی سیاحت سے محرومی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ کو چپکے سے پنجاب دکھلا لاتے ہیں مگر قانون توڑنا مجھے منظور نہ تھا، اس لیے میں نے اپنا سفر ہریانہ کے شہر انبالہ سے شروع کیا۔

وہاں اردو کے دو بڑے سرپرست میری راہ تک رہے تھے۔ راجندر ملہوترا صاحب اور کے بی پرواز نے میری رہنمائی کا فرض سنبھالا۔ وہ مسجد دکھائی جہاں 1947ء کی قیامت کے دوران اغوا کی جانے والی مسلمان لڑکیوں کو پناہ دی جاتی تھی اور جہاں اس روز دو ہندو لڑکے بیٹھے قاری محمد اسحاق سے اردو سیکھ رہے تھے۔ انبالہ کا وہ ہوائی اڈہ دکھایا جس پر 1965ء کی جنگ میں پاکستانی فضائیہ نے ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے تھے اور سینٹ پال کے گرجا گھر کو ہوائی اڈے کی عمارت سمجھ کر ڈھا دیا تھا۔ وہیں قدم قدم پر بزرگوں کے مزار دیکھے جن پر علاقے کے ہندو چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور ڈیری فارم کا مزار تو ہندوؤں میں اتنا مقبول ہے کہ عقیدت مندوں کو اپنی باری کے لیے قطاریں بنانی پڑتی ہیں۔

انبالہ سے دلّی جانے کے لیے میرے قدم اس جانب اٹھے جہاں سے دلّی جانے والے ہر لشکر کو گزرنا ہوتا تھا اور آگ اور خون کا دریا پار کرنا پڑتا تھا۔ میرا اگلا پڑاؤ پانی پت تھا جہاں چار سو ساٹھ سال پہلے کابل کے مغل حکمراں بابر کو جانا پڑا تھا اور دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی سے ٹکر لینی پڑی تھی۔ لوہے لاٹ کی بنی ہوئی ٹاٹا کی بس میں، جس کا انجن کسی بھٹی کی طرح دہک رہا تھا، سوار ہو کر میں پانی پت کی طرف چلا اور کروکشیتر سے گزرتے ہوئے میں نے دعا کی کہ مجھے کسی معرکہ آرائی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

راستے میں کرنال آیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کا شہر۔ میں وہاں اتر پڑا اور ڈھونڈتا ہوا نوابوں کی حویلی تک جا پہنچا۔ اب وہاں بھینسیں بندھی تھیں۔ دیواروں پر اُپلے تھاپے گئے تھے اور

لوہے کے تاروں کی الگنی پر گیلے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے اس شخص کے آبائی مکان کو عقیدت سے دیکھا کہ جو پاکستان کا پہلا وزیراعظم تھا اور جس روز اسے گولی ماری گئی، اس روز اس کے بینک کے کھاتے میں صرف تین سو روپے تھے۔ میں نے ریڈیو پاکستان کی خبروں میں اس کے آخری الفاظ اور گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔

میں نے تو سنا تھا کہ فرشتوں پر گولی اثر نہیں کرتی۔

کرنال میں حضرت بوعلی شاہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر میں پانی پت پہنچا۔ وہاں بھی میرے میزبان نے کہا کہ آیئے آپ کو حضرت بوعلی شاہ کی قبر پر لے چلیں۔ یہی واقعہ نادر شاہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ برہم ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ایک فقیر دو جگہ کیسے دفن ہو سکتا ہے، حضرت کی قبر کے تعویذ پر تلوار کا وار کیا، تعویذ سلامت رہا۔ یہ ایک بزرگ کی قبر کا تعویذ تھا، ولی کے گلی کوچوں کی آبادی نہیں تھی۔

جس وقت میں پانی پت پہنچا، غضب کی بھوک لگی تھی اور دل چاہتا تھا کہ کہیں سے گرم نان اور اتنا ہی گرم سالن مل جائے۔ میں درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا تو وہاں کے مجاوروں کو میرے آنے کی خبر کی گئی۔ وہ لپکتے ہوئے آئے۔ مجھ سے گلے ملے اور بولے کہ آپ بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں، کھانا تیار ہے۔

دستر خوان پر دیکھا۔ گرم گرم تازہ نان اور بھاپیں اٹھتا ہوا سالن چنا ہوا تھا۔ دریچے سے ایک قلندر کی درگاہ کے آہنی ستون صاف نظر آ رہے تھے۔

بڑے بڑے لوگ ملے، حالی پانی پتی سے لے کر وہیں قریب کے میدانوں میں لڑی جانے والی تین جنگیں ہمارا موضوع بنیں لیکن ایک سادہ لوح دیہاتی کا ملنا مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

دین محمد رہتک کے ایک گاؤں سوگرا کھیڑی کا باشندہ تھا اور بوعلی شاہ کو سلام کرنے وہاں آیا ہوا تھا۔ مجھے خالص رہتک کے جاٹوں کے لہجے میں اپنے اور گاؤں کی ہندو مسلم آبادی کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے میرے ہر سوال کا جواب دیا۔ ایک مجمع لگ گیا جو اس کے لہجے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

میں نے دین محمد سے پوچھا کہ گاؤں والوں کا کیسا سلوک ہے تمہارے ساتھ۔ اس کا جواب، اسی کے لب و لہجے میں یوں تھا کہ تاریخ میں لکھا جائے:

''بس ہم خدا کی طاقت سے ہیں۔ ہم اب بھی کہتے گاؤں والوں سے۔ جیسے گاؤں والے چلتے ہیں ویسے ہم چلتے ہیں۔ وہ ایمانداری پر چلیں گے، ہم بھی ایمانداری پر چلیں گے۔ وہ

بے ایمانی پر چلیں گے، ہم بھی چلیں گے۔ ہم نے صاف کہہ دیا ہے، دب کر نہیں رہیں گے۔ کب تک رہیں گے دب کر؟"

بالکل یوں لگا کہ پانی پت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔

میری بس دلی میں داخل ہوئی۔ ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ ہر سینما گھر میں فلم "بہو کی پکار" لگی ہوئی تھی جس کے پوسٹر میں دکھایا گیا تھا کہ ساس اور نندیں وعدے سے کم جہیز لانے والی بہو پر مٹی کا تیل چھڑک کر اسے آگ لگا رہی ہیں اور ہر دیوار پر بڑا بڑا اشتہار لکھا گیا تھا: بہترین رشتوں کے لیے ہم سے ملیں۔

مال ایک طرف سے آ رہا تھا اور ہاتھ کے ہاتھ کھپتا جا رہا تھا۔

جامع مسجد کی پرانی گلیوں میں اتنے ہی پرانے بزرگ لالہ امرناتھ سے ملاقات ہوئی۔ مسلمان آبادی کے بیچوں بیچ رہتے تھے اور علاقے میں ان کی بہت عزت تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ آپ اتنے بہت سے مسلمانوں کے درمیان کیسے رہ لیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میری ساری عمر یہیں گزری ہے۔ ہندو مسلمان سب مل کر رہتے ہیں۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ یہ ہماری عزت کرتے ہیں۔

کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ لالہ امرناتھ کا بیٹا انہیں لے گیا اور وہ روتے ہوئے گئے۔

دلی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ ایک شہر نہیں بلکہ کئی شہر تہ در تہ ہیں، جیسے پرت کے اوپر پرت جما دی گئی ہو۔ میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے خلیق انجم کو ساتھ لیا اور ان سے کہا کہ مجھے شیر شاہ والا شہر دکھایئے یعنی وہ کھنڈر جو کبھی شیر گڑھ تھے اور اب پرانا قلعہ کہلاتے ہیں۔ انہوں نے تاریخی دروازے دکھائے۔ فصیلیں دکھائیں اور سب سے بڑھ کر پرانا قلعہ دکھایا۔ اس کی شیر شاہی مسجد دکھائی۔ وہ عمارت دکھائی جو شیر منڈل کہلاتی ہے جس کے دریچوں میں بیٹھ کر ہمایوں ستارے دیکھا کرتا تھا۔ ستارے مستقبل کا حال بتا رہے تھے مگر وہ شہنشاہ ہند کو یہ نہ بتا سکے کہ کچھ دیر بعد زینے سے گر کر مر جاؤ گے۔

پھر ہمایوں کا مقبرہ دیکھا جہاں سے انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے بیٹوں کو گرفتار کیا۔ اس روز بوڑھے بادشاہ کا سر کیا جھکا، پورے ہندوستان کا سر جھک گیا تھا۔

جس روز میں آگرہ پہنچا، وہاں اتنی شادیاں ہو رہی تھیں کہ میرا خیال ہے اس کے بعد شہر میں کوئی دلہن بیاہا نہیں رہا ہوگا آگرہ یوپی کا چوتھا بڑا شہر ہے اور قدم قدم پر جدید صنعتیں لگ گئی ہیں مگر شہر کے کردار سے شاہجہاں کا دور آج تک جھلکتا ہے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اکبر اور شاہجہاں کے زمانے کی شاندار عمارتوں کے کھنڈر ملنا شروع ہو گئے۔

اب رہ گئی بازاروں کی رونق تو سچ یہ ہے کہ آگرے کا مقابلہ نہیں۔ ایسے بھرے پُرے بازار دیکھنے کو کم ہی ملتے ہیں۔ وہیں میری ملاقات اپنے وقت کے بڑے شاعر میکش اکبر آبادی سے ہوئی۔ بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے مگر میرے خیر مقدم کے لیے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دہلی والے انہیں ایوارڈ دینے کے لیے خود چل کر ان کے گھر آ رہے تھے۔

جرنیلی سڑک کا سفر آخر مجھے وہاں لے گیا جہاں میں نے عمر بھر چاہا تھا کہ کوئی مجھے لے جائے۔ تاج محل دیکھ کر طے کرنا مشکل ہو گیا کہ کیا یہ وہی دیکھا بھالا تاج محل ہے یا کوئی نیا والا اور اچھوتا تاج محل۔ اس کا نام کبھی روضۂ ممتاز محل تھا۔ دیہاتیوں کے منہ سے یہ نام ادا نہ ہو سکا۔ انہوں نے اسے تاج محل بنا دیا۔

تاج محل اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ اس کی چولیں ہل رہی ہیں۔ سنگِ مرمر میں اتارے ہوئے عربی حروف نکل کر گرنے والے ہیں مگر اس کی پروا نہ تو حکام کو ہے اور نہ شاہجہاں کو پہنچا ہوا بزرگ ماننے والوں کو۔ کچھ لوگوں نے اس کی قبر پر منتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس پر کسی سرکاری بابو نے حکم دیا کہ اصل عمارت کے صدر دروازے پر بڑی بڑی کیلوں سے ایک بورڈ ٹھونک دو اور بورڈ پر لکھ دو کہ مزار پر چڑھاوے چڑھانا ممنوع ہے۔ اس پر محکمہ کے مزدور چار بڑی بڑی کیلیں اور ہتھوڑا لے کر آئے اور سنگِ مرمر کی دیوار پر پہلا ہی کیلا گاڑ رہے تھے کہ عمارت کا ایک حصہ ٹوٹ کر فرش پر گرا۔ یہ دیکھنے والے سیاحوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مزدوروں کو حکم ہوا کہ یہ دیوار چھوڑ دو اور سامنے والی دیوار پر بورڈ لگا دو۔

کیسی خراش پڑی ہے ایک دل ربا عمارت کے رخسار پر۔

کہتے ہیں کہ تاج محل کے حسن کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اسے دیکھنے کے لیے چاندنی رات میں آئے ہیں یا بھری دوپہر میں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ اسے دیکھنے کس کے ساتھ آئے ہیں۔

میرا اگلا پڑاؤ کانپور تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے میں طوفان میل میں بیٹھا۔ اس ٹرین میں میل ہو تو ہو، طوفان جیسی کوئی بات نہ تھی۔ میرے ڈبے میں دو پولیس والے بھی بیٹھے تھے۔ سنا ہے راستے میں ڈاکو اس پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ ایسی مریل ٹرین پر ڈاکہ ڈال کر ڈاکو اپنا وقت ہی ضائع کرتے ہوں گے۔

بڑی مشکل سے گاڑی کانپور پہنچی جو یوپی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر کی ہر چیز بڑی ہے، صنعت، غلاظت، غریبی، دکھ اور مصائب سارے کے سارے بڑے ہیں۔ اگر میرے نانا کا شہر نہ ہوتا تو مجھے اس سے ذرا سی بھی رغبت نہ ہوتی۔ والدہ کا گھر دیکھنے میں محلہ پٹکاپور پہنچا۔ وہاں تو غریبی اور مفلسی نے گھر کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کا علاقہ تھا اور ہر مکان میں چھوٹی گھریلو صنعتیں لگی تھیں جن میں گھر کے بڑے بوڑھے، بچے، بالے اور بہو بیٹیاں، سب کام کر رہے تھے۔ وہاں ہر شخص نے ایک ہی بات کہی "صاحب پہلے گھر کا ایک شخص کماتا تھا، باقی سارے آرام سے کھاتے تھے۔ اب سارے مل کر کماتے ہیں تب گزارہ ہوتا ہے۔"

میرے نانا حکیم محمد یوسف کے گھر میں آباد لوگوں نے مجھے فوراً ہی ماموں قرار دے دیا اور کہا کہ چلیے، آپ کو آپ کے بزرگوں کے قبرستان لے چلیں۔

دیکھا تو بہت بڑا اور بہت پرانا قبرستان تھا جہاں قبروں کی دیکھ بھال کے کام پر اتنی ہی پرانی خاتون مقرر تھیں۔ شہر والے انہیں ہر مہینے تنخواہ کے نام پر ساٹھ روپے دے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا گیارہ بارہ برس کا نواسا قائم رضا بھی تھا۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے پوچھا: "اسکول جاتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کیا کرتے ہو؟"

"اسکوٹر کا کام سیکھتے ہیں۔"

"کتنے پیسے ملتے ہیں؟"

"ابھی دیتے ہی نہیں۔"

"کب دیں گے؟"

"جب دیں۔"

"دوسرے لڑکوں کو کتنے پیسے دیتے ہیں؟"

''بیچے دیں۔''
''تمہیں کب دیں گے پیسے؟''
''جب دیں!''
میں نے قائم رضا کی نانی سے پوچھا'' آگے چل کر کیا ہوگا؟''
''مولا آئیں گے۔ ہم لوگ انتظار میں ہیں۔ کس وقت آئیں مولا۔''

آج کے کان پور اور ماضی کے کان پور کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں آج کے الہ آباد اور ماضی کے الہ باس پہنچا۔ جہاں گنگا اور جمنا ملتے ہیں وہاں میں اوپندر ناتھ اشک سے ملا۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار جنہوں نے خود اپنی زندگی کو افسانہ بنا دیا تھا۔ ضعیفی اور بیکاری سے تنگ آکر انہوں نے پرچون کی دکان کھول لی تھی۔

الہ آباد علم کا مرکز تھا۔ اب بھی ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا الہ آباد بورڈ کا نام سنا جس کے میٹرک کے امتحان میں لاکھوں طالب علم بیٹھتے ہیں اور پھر وہیں سے نتیجے کا گزٹ جاری ہوتا ہے۔ میں نے شہر دیکھا۔ ریلوے لائن کی ایک جانب اونچا نگر اور دوسری طرف نیچا نگر، لیکن مجھے یونیورسٹی دیکھنے کا اشتیاق تھا کیونکہ علاقے کے سارے ہی بڑے تاریخ داں وہیں ہوا کرتے تھے۔ میں گیا تو نئے وائس چانسلر آر پی مصرا صاحب نے میزبانی کی اور اپنے دو بڑے استادوں سے میری ملاقات کرائی۔

ان میں ایک تاریخ کے جید عالم ڈاکٹر رادھے شام تھے اور دوسرے اردو کے سرکردہ استاد اور محقق پروفیسر عقیل رضوی تھے۔ دونوں نے جرنیلی سڑک اور اس کے معمار کے بارے میں اتنی دلچسپ اور کارآمد باتیں بتائیں کہ ذہن میں روشنی بھر گئی۔

یونیورسٹی کی عمر ایک سو برس ہونے میں صرف دو سال باقی تھے جس کی خوشی میں انجینئرنگ کے لڑکوں نے چالیس سال سے بند پڑے ہوئے گھنٹہ گھر کے کلاک کو اتروا کر اور اس کی مرمت کر کے دوبارہ لگایا اور اس کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو علاقے کے بزرگ خوشی کے مارے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ انہیں اپنے جوانی کے دن یاد آ گئے۔

جمنا تو گنگا میں گر گئی۔ اب گنگا تنہا چلی اور وہاں پہنچی کہ جو کوئی مر کر اس میں غرق ہو جائے وہ سیدھا سورگ کو جائے۔ جنت کا یہاں وہ تصور نہیں جو ہمارے قبائلی پہاڑوں میں ہے۔

وہاں تو ایک لمحے میں حوروں کی آغوش مل جاتی ہے۔ بنارس میں زندہ رہنے کے لیے بڑے کشٹ اٹھانے پڑتے ہیں۔

بنارس کی ساڑھیاں مشہور ہیں۔ میں ان کے کارخانوں میں گیا۔ کئی لاکھ آدمی ساڑھیاں بننے میں مصروف تھے۔ چند ایک کے سوا سارے مفلس اور مفلوک الحال مسلمان تھے۔ ہاں، ان کے ماہر ہاتھوں کی تیار کی ہوئی ساڑھیاں کوڑیوں کے بھاؤ خرید کر اور آگے لے جا کر لاکھوں میں فروخت کرنے والے چند ایک کے سوا سارے غیر مسلم تھے۔

بنارس سے نکل کر ہماری بس یو پی کو پیچھے چھوڑ کر بہار میں داخل ہونے والی تھی۔ اچانک کسی نے کہا کہ بہار آ گیا۔ پوچھا گیا کہ آپ کو کیسے پتا؟ اس نے کہا کہ راستے میں ملنے والے بجلی کے تار تانبے کے تھے۔ اب ان کی جگہ المونیم کے تار نظر آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے بہار آ گیا۔ اس کا مطلب سمجھنا کچھ آسان نہ تھا۔ کسی نے ہمارے چہرے کی کیفیت دیکھ کر اور اس پر ترس کھا کر بتایا کہ بہار میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ یہ چور تانبے کے تار کاٹ کر لے جایا کرتے تھے۔ تنگ آ کر حکام نے المونیم کے تار کسوا دیے ہیں اور المونیم بھی وہ جو صرف لوٹے بنانے کے کام آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چور اب تار کاٹنے کی زحمت نہیں کرتے۔

میرا اگلا پڑاؤ بہت اہم تھا۔ جرنیلی سڑک کے معمار شیر شاہ سوری کا شہر سہسرام۔ یہیں سے وہ اٹھا اور ہندوستان پر چھا گیا اور بالآخر یہیں پیوند خاک ہوا۔ وہ جتنا عظیم بادشاہ تھا، سہسرام میں اتنا ہی عظیم اس کا مقبرہ ہے۔ دیکھیں تو لگتا ہے کہ مزدوروں نے عمارت نہیں اٹھائی، خوبصورت تراشا ہوا پہاڑ اٹھایا ہے۔ یہ مزار بنوانے والے اس کے بیٹے نے اپنے مزار کی تعمیر بھی شروع کرائی تھی لیکن وقت کی دوڑ میں موت جیت گئی۔ عمارت ہار گئی۔ اس کی ادھوری دیواروں کی آڑ میں اب غلاظت کے انبار لگے ہیں۔

بہار کے تاریخی شہر سہسرام میں ایک ایسا شخص ملا کہ اس کے ملنے سے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی خود شیر شاہ کے ملنے سے ہوتی۔ ان کا نام تھا دسرتھ دوبے۔

میں شیر شاہ کے مرقد پر چھائی ہوئی چادر کو غور سے دیکھ رہا تھا جس پر سونے چاندی کے تاروں سے کلمہ توحید کاڑھا گیا تھا۔ کسی نے میرے کان میں کہا کہ یہ چادر دسرتھ دوبے جی نے چڑھائی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کون ہیں۔ جواب ملا کہ حیرت ہے آپ انہیں نہیں جانتے۔ انہوں

نے ہی نے تو دلّی جا جا کر اور حکام سے لڑ جھگڑ کر جی ٹی روڈ کا نام شیر شاہ سوری مارگ رکھایا ہے۔

میں مچل گیا کہ ان سے ضرور ملوں گا۔ لوگ دوڑائے گئے اور انہیں ڈھونڈ لائے۔ پتا چلا کہ سہسرام کے قدیم ہندو باشندے ہیں جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ تاریخ میں شیر شاہ کو اس کا جائز مقام دلا کر دم لیں گے۔ یہی نہیں بلکہ سہسرام میں شیر شاہ، اس کے باپ، اس کے بیٹے اور اس کے جرنیل اور معمار کے جو جو مقبرے اور دوسری یادگاریں ہیں، ان کی حفاظت کر کے رہیں گے۔ حالات انہیں مایوس کرتے ہیں تو کاغذوں کا پلندا اٹھائے دلّی پہنچ جاتے ہیں اور حکام سے لڑ جھگڑ کر کبھی رقم منظور کرا لاتے ہیں اور کبھی مرمت کی منظوری لے آتے ہیں۔

سرکاری افسران سے کہتے ہیں کہ "تم شیر شاہ کے کچھ لگتے ہو؟"

یہ اپنے مخصوص بہاری لہجے میں جواب دیتے ہیں "ہاں، ہم ان کا لڑکا ہیں۔"

دسرتھ دوبے صورت شکل اور وضع قطع سے بھی کچھ ایسے ہیں کہ ایک بار پوجا کرنے مندر میں گئے تو اپنا شناختی کارڈ دکھانا پڑا۔

میں آواگون کا قائل نہیں تھا، اب ہوں۔

سہسرام سے آگے شیر گھاٹی تھی۔ پھر بردوان کا صنعتی علاقہ تھا۔ مجھے ہر وہ جگہ دیکھنے کا اشتیاق تھا جس کے نام میں شیر لگا ہے مگر میرے سہسرام کے میزبان اڑ گئے۔ ہم آپ کو بس سے نہیں جانے دیں گے کیونکہ راستے میں ڈاکو بہت ہیں۔ اکثر بسوں کے مسافر لوٹے جاتے ہیں۔ براہِ کرم آپ ریل گاڑی سے چلے جایئے۔

میں بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی رائے سے انکار کرنے ہی والا تھا کہ لڑکوں کے مجمع میں شامل ایک چھوٹا سا لڑکا آہستہ سے بولا کہ یہ جو آپ بڑا سا تھیلا بھر کر آوازوں کے ٹیپ لے جا رہے ہیں، یہ اگر چھن گیا تو کیا ہوگا؟

یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ بھی صوبہ بہار کی زمین۔ انبالہ سے یہاں تک میں جو سیکڑوں آوازیں ریکارڈ کرتا آیا ہوں اگر ان کے ٹیپ چھین لے گئے تو کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ ڈاکو گانے سننے کی غرض سے انہیں چلائیں گے تو کہیں پانی پت کا دین محمد اپنے رہتک کے لہجے میں بول رہا ہوگا اور کہیں قائم رضا کی نانی اپنے مخصوص کانپوری لب و لہجے میں مولا کے انتظار کی کیفیت بیان کر رہی ہوں گی۔ بالآخر میری راستے بھر کی محنت آگ میں جھونک دی جائے۔

گی اور بھوج پوری لہجے میں میرے حق میں جو کچھ کہا جائے گا، اسے تصور کرنا مشکل نہیں۔

یہاں میں اعتراف کرتا چلوں کہ اپنے پروگرام "جرنیلی سڑک" میں سہسرام اور کلکتے کے درمیان علاقے کی جو تصویر کھینچی گئی وہ میری آنکھوں دیکھی نہ تھی۔ وہ سارے منظر کتابوں کے اوراق سے نکلے تھے۔

میں بنگال کا شہر بردوان نہ دیکھ سکا جہاں نور جہاں اور شیر افگن رہتے تھے، جہاں جہانگیر کے دودھ شریک بھائی قطب الدین نے شیر افگن کو مارا تھا اور اس طرح نور جہاں ہندوستان کے فرمانروا جہانگیر کے نکاح میں آئی تھی۔ وہیں بہرام شاہ دفن ہیں جو بہرام سقہ کے نام سے مشہور ہیں اور جنہیں ایک دن کے لیے بادشاہ بنایا گیا۔

یہی وہ علاقہ ہے جہاں جرنیلوں کی نگرانی میں گرینڈ ٹرنک روڈ بنی تھی۔ یہ بات 1857ء کی ہے۔ اس کے اگلے برس یہاں ریل گاڑی چل گئی اور ملک کی سب سے زیادہ اہم سڑک اچانک غیر اہم ہوگئی۔

مجھ میں اور مرزا غالب میں بس ایک ہی بات مشترک ہے۔ کلکتے کو دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے تھے، میں بھی حیران ہوا تھا۔ انہوں نے پہلی بار اتنا بڑا پانی کا سمندر دیکھا ہوگا، میں نے انسان کا سمندر دیکھا۔ ہندوستان بھر میں کسی کو جب روزی نہیں ملتی تو وہ کلکتہ چلا جاتا ہے۔ غالب بھی پنشن کی خاطر گئے تھے لیکن ایک جدید شہر اور نئے زمانے کی ایجادات دیکھ کر شہر کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔

جن دنوں میں کلکتہ پہنچا، اخباروں میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بیان چھپا تھا کہ کلکتہ مر رہا ہے۔ شہر میں داخل ہوا تو وہاں بھی یہی بحث جاری تھی۔ دریائے ہگلی کی تہ میں اتنی ریت بیٹھ چکی تھی کہ شہر کی بندرگاہ بیکار ہو چکی تھی۔ حکومت والے شہر سے باہر ہلدیا کی نئی بندرگاہ بنا رہے تھے مگر وہاں ایک عجیب جھگڑا تھا اور وہ یہ کہ نئی بندرگاہ میں روزگار صرف اور صرف مقامی باشندوں کو ملے گا اور وہاں غیر مقامی باشندوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

شہر کے بارے میں بنگال اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کلیم الدین شمسی صاحب نے دلچسپ بات بتائی۔ کہنے لگے کہ اس شہر کی آبادی دن میں ایک کروڑ بیس لاکھ اور رات میں ایک کروڑ ہوتی ہے۔ بیس لاکھ افراد نواحی علاقوں سے اپنی نوکریوں پر آتے ہیں اور دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ یہ بیس لاکھ افراد جو پیسہ اس شہر سے کماتے ہیں، شہر کو

ٹیکس کے طور پر اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔

یہ تھا کلکتے کا المیہ، پھر بھی سوچئے کہ یہ شہر ایک کروڑ افراد کو پال رہا ہے اور جنہیں پالنے والا کوئی نہیں اور جو کوڑے کے ڈھیر سے چن کر غذا کھاتے ہیں، انہیں مدر ٹریسا کا چرچ پال پوس کر بڑا کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے شہر مر رہا ہو مگر شہر والے جیسے تیسے حال میں بھی جی رہے ہیں۔

میں اس روز جی ٹی روڈ کا آخری سرا ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی نے بتایا کہ بوٹینیکل گارڈن کے سامنے ہے۔ پودوں کے اس عجائب گھر میں پہنچا تو ایک مجمع دیکھا جو عین وسط میں لگے ہوئے ایک بڑے سے پرانے پودے کے گرد کھڑا اسے تکے جا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ اس پودے میں غالباً دس سال بعد پھول کھلتا ہے، وہ اب کھلنے والا ہے۔ لوگ بچے کی ولادت کی طرح اس کا انتظار کر رہے تھے۔

مجھے پھول سے زیادہ سڑک کے آخری کنارے سے دلچسپی تھی۔ ایک پڑھے لکھے صاحب نظر آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا گرینڈ ٹرنک روڈ یہاں ختم ہوتی ہے؟ انہوں نے حیرت سے میرے منہ کو دیکھا اور بولے ''ختم ہوتی ہے؟ ارے صاحب، جی ٹی روڈ یہاں سے شروع ہوتی ہے اور پشاور تک جاتی ہے۔''

واہ، یہی سوچ کر کلکتے والے خوش ہیں اور ایسا ہی خیال پشاور والوں کا جی بہلاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں سفید فام حکمرانوں کی حکمت۔

میں نے بھاگم بھاگ کلکتے میں اپنے کام مکمل کیے کیونکہ کراچی میں میری پہلی کتاب ''کتب خانہ'' کی رسم اجرا ہونے والی تھی جس کا کتاب کے ناشر اسماعیل سعد نے بڑا اہتمام کیا تھا اور اس موقع پر میرا موجود ہونا ضروری تھا۔ اب میں اڑانیں بھرتا ہوا اگلے روز کراچی جا پہنچا۔ رسم اجراء کے فوراً بعد مجھے پشاور جانا تھا اور وہاں سے لاہور تک جرنیلی سڑک کا سفر مکمل کرنا تھا مگر کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ کتاب کی تقریب بارہ روز کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہوتا تو ہندوستان میں اپنا کام دلجمعی سے پورا کرتا۔ اب اس تاخیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہ رمضان آ پہنچا اور ایک مسلم ملک میں روزوں کے دوران سفر کرنا، لوگوں سے ملنا، ان سے باتیں کرنا اور اپنی دلچسپی کے مقامات دیکھنا ناممکن تو نہیں، دشوار ضرور ہوتا ہے۔ مجھے مجبوری کے آگے سر خم کرنا پڑا۔

''کتب خانہ'' کی رسم اجرا بہت اہتمام سے ہوئی۔ اپنے وقت کے بڑے سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صدر جلسہ تھے۔ دوسرے مقررین میں ہاشم رضا، گوپی چند نارنگ اور نصر اللہ خاں شامل تھے۔ افضال شیروانی نے نظامت کی تھی اور مہمانوں میں میرے سارے ہی

عزیز، دوست اور احباب شریک تھے۔

تقریب ختم ہوئی۔ ہوائی جہاز پر پشاور کے لیے نشست مخصوص ہوگئی۔

ماہِ رمضان تھا اور وہ بھی موسم گرما کا۔ شکر ہے کہ پی آئی اے کی پرواز سویرے سویرے تھی۔ کراچی کی شام کی طرح صبح بھی خوشگوار ہوتی ہے۔ میں طیارے کے مسافروں کی قطار میں کھڑا ہوا تو دیکھا وضع قطع سے سارے دوسرے مسافر پختون اور قبائلی تھے۔ میں یہ سوچ کر کچھ نادم سا تھا کہ طیارے میں صبح کا ناشتہ پیش کیا جائے گا تو شاید میں تنہا روزہ خور مسافر ہوں۔

ہوا یہ کہ طیارہ اڑنے کی تھوڑی ہی دیر بعد ناشتے کی ٹرالی آ گئی۔ پورا ہوائی جہاز تازہ آملیٹ اور شامی کبابوں سے مہکنے لگا۔ ایئر ہاسٹس نے صدا لگائی ''کون کون روزے سے نہیں ہے؟''

اتنے بہت سے ہاتھ اٹھے کہ میں ہاتھ اٹھانا بھول گیا۔

ہر مسافر پشتو میں کچھ بولا۔ صاف سمجھ میں نہیں آیا لیکن مطلب سب کا ایک ہی تھا۔ ''سفر میں روزہ معاف ہے۔''

میں نے سکھ کی سانس لی۔ یہ سوچ کر اطمینان سا نصیب ہوا کہ گرمیوں کے دوران میں بسوں کے اس سفر میں بھوکا پیاسا نہیں رہوں گا۔ یہی ہوا۔ راستے میں دوپہر کے وقت میری بس جہاں بھی رکتی، طعام خانوں پر بینر آویزاں ہوتا جس پر لکھا ہوتا کہ یہاں مسافروں اور بیماروں کو کھانا دیا جائے گا۔ اندر جا کر دیکھتا تو ہر ہوٹل مسافروں، بیماروں اور پولیس والوں سے بھرا ہوتا۔ اس وقت تک کلاشنکوف ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

دو ہزار سال پرانا شہر پشاور دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سبزہ تھا۔ ورنہ پورا شہر مٹیالا سا تھا۔ ہزار سال پہلے اس کا نام پشپ پور تھا یعنی پھولوں کا شہر مگر جن دنوں میں وہاں پہنچا۔ وہ سہما سہما سا شہر نظر آیا۔ وہاں افغان پناہ گزینوں کی یلغار آ چکی تھی اور جن روسی فوجوں کے خوف سے یہ پناہ گزین بھاگے تھے، وہ پاکستان کی سرحد تک آ چکی تھیں۔ پشاور یونیورسٹی کے اساتذہ نے بتایا کہ انہیں اپنے مکان بنانے کے لیے زمینیں تو مل گئی ہیں مگر لوگ مکان بناتے ہوئے ڈر رہے ہیں کیونکہ روسی فوج ان کے سروں پر آ پہنچی ہے۔ پشاور تو یوں بھی اسمگلروں کی آماجگاہ ہے۔ ایک زمانے میں وہاں کی دکانوں میں ایران اور چین کا مال بکا کرتا تھا، اب وہاں ریفریجریٹر سے لے کر عمارتی لوہے کے سریے تک روس سے آ رہے تھے۔ وہی روس، جس کی پیش قدمی روکنے کے لیے

انگریزوں نے اپنی فوجیں کی فوجیں کٹوادی تھیں۔ غضب ہے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

پشاور دنیا کے ان قدیم شہروں میں شامل ہے جو ہزار ہا سال سے آباد ہیں۔ حال یہ ہے کہ کہیں گڑھا کھودیے تو اس میں سے پرانے پشاور کے آثار نکلتے ہیں۔ زیادہ گہرا گڑھا کھودیے تو زیادہ پرانا پشاور نکلتا ہے۔ حیرت ہے۔

ایسے قدیم شہر کے گلی کوچے دیکھتا ہوا میں ان گیراجوں میں پہنچا جہاں ٹرکوں اور بسوں پر پھول بوٹے بنائے جاتے ہیں اور مالک کے اپنے موزوں کیے ہوئے شعر لکھے جاتے ہیں۔ پھر میں نے پیروں کے مزار دیکھے۔ شادی پیر کے مزار پر شادی کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور وہ تو کچھ بھی نہیں۔ قلعہ بالا حصار کے سائے میں گرم پیر کا مزار ہے۔ اتنے گرم کہ ادھر مراد مانگی، اُدھر پوری ہوئی۔

مگر مجھے تو اس مقام اور اس ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں سے میری جرنیلی سڑک شروع ہوتی تھی۔ کسی نے بتایا کہ صدر کے علاقے میں جس جگہ پرانا ڈاک بنگلہ تھا، وہیں سڑک کے کنارے بڑا سا سفید پتھر کھڑا نظر آیا کرتا تھا، اب وہ نظر نہیں آتا۔

یہ سن کر میں وہاں پہنچا جہاں سرکار انگلیشیہ کا ڈاک بنگلہ تھا۔ اب وہاں سیمنٹ کی اونچی عمارت کھڑی تھی اور اس کے سامنے سڑک کے کنارے ایک بڑا سا میل کا پتھر اوندھا پڑا تھا جیسے اسے دھکیل کر نالی کے اوپر راہگیروں کے لیے پُل بنا دیا گیا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ یہی زیرو پوائنٹ کا پتھر ہوگا۔

میں لپک کر اس کے قریب گیا اور جھک کر غور سے دیکھا۔ ایک سو تیس سال پرانے اس پتھر کے سارے نقوش اب مٹ چکے تھے۔ البتہ اس پر کھدا ہوا ایک بڑا سا گول صفر یوں نظر آیا جیسے پتھر حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہا ہو۔

ریڈیو پر اس کا ذکر نشر ہونے کے بعد حکام نے اسے اٹھا کر شاید پتھر پھوڑنے والی مشین میں ڈال دیا۔

مگر اس سڑک پر چلتے ہوئے گزرے وقت کی نشانیوں نے ایک لمحے کو بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ پشاور سے راولپنڈی کی طرف چلتے ہوئے دریائے سندھ پار کرنے سے پہلے میرے بائیں ہاتھ پر گمنام سے گاؤں لہور اور ہنڈ پڑے۔ سنسکرت کا سب سے بڑا عالم پانینی لہور میں پیدا ہوا تھا۔ ہنڈ وہ مقام ہے جہاں سے سکندر اعظم کے لشکر نے دریائے سندھ کو پار کیا تھا۔ قدیم قلعہ دیکھتے ہوئے میں اٹک سے گزرا، دریا کے اس حصے کو نیلگوں پانی کے تعلق سے نیلاب کہا جاتا تھا۔ دریا پار وہ مقام تھا جس کا نام باغ نیلاب تھا اور شیر شاہ سوری کے ہندوستان کی وہی سرحد تھی اور اس

کے قبیلے کے فوجی بھرتی ہونے کے لیے دریا پار کر کے باغ نیلاب میں اترتے تھے اور جس تاریخی سڑک کا ہم سفر کر رہے ہیں، وہ پشاور سے نہیں، باغ نیلاب سے شروع ہوتی تھی۔

حسن ابدال اور واہ کے پرانے آثار دیکھتے ہوئے ہم راولپنڈی پہنچتے ہیں۔ گکھڑوں کی اس سرزمین پر ہم جہلم کے قریب قلعہ رہتاس میں داخل ہوتے ہیں جسے شیر شاہ نے خیبر کی طرف سے ہونے والے حملوں کو روکنے کے لیے بنایا تھا۔ ویسا ہی اور اسی نام کا دوسرا قلعہ دور مشرق میں سہسرام کے مقام پر بنایا گیا تھا۔ جہلم کے رہتاس پر ایک روز بھی لڑائی نہیں ہوئی اور اس سے پہلے کہ لڑائی کی نوبت آتی، شیر شاہ کی واپسی کی نوبت بج گئی۔

رہتاس کے قریب وہ پہاڑی ہے جہاں جا کر رانجھا نے جوگ لیا تھا اور بالے ڈالنے کے لیے اس کے کان چھیدے گئے تھے تو چٹانوں پر خون ٹپکا تھا۔ کہتے ہیں اس کے دھبے آج تک موجود ہیں۔ رہتاس کے قریب سے سکندر اعظم کا لشکر گزرا تھا اور دریائے جہلم کے نزدیک ہندوستانی راجا پورس نے اس کا راستہ روکا تھا۔ مورخوں کو آج تک نہیں معلوم کہ یہ پورس کون تھا، اس کا اصل نام کیا تھا اور وہاں بننے والا سکندر کے چہیتے گھوڑے کا مقبرہ کہاں گیا۔

بے خبری کے ان میدانوں سے گزر کر میں جہلم پہنچا۔ اٹک کی طرح اس کا ریل کا پل بھی سو سال پرانا ہو چکا تھا اور انہیں بنانے والے انگریز ہدایت کر گئے تھے کہ ان پلوں کی عمر ایک سو برس ہے۔ اس کے بعد ان پر ریل گاڑیاں نہ چلانا۔ انگریزوں کی ہدایت اتنی سعادت مندی سے مان لی گئی کہ آج کے حکام (2010ء) ان پلوں ہی پر نہیں، ہر پل اور ہر پٹڑی پر ریل گاڑیاں بند کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کیسا عظیم نیٹ ورک تھا، کیسی بے دردی سے اسے ویرانے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ جہلم کے پل پر یاد آیا کہ جس روز میٹرک کے نتیجے کا اعلان ہوتا ہے، دریا کے اس بہت بڑے پل پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے تاکہ مایوس نوجوان وہاں سے چھلانگ لگا کر خودکشی نہ کریں۔

میرا اگلا پڑاؤ گجرات تھا جو کبھی گجرات شاہ دولہ والا کہلاتا تھا۔ یہیں تو وہ کوزہ گر رہتے تھے کہ جن کے بنائے ہوئے مٹی کے پیالے اتنے نفیس ہوتے تھے کہ ان میں دھوپ چھنا کرتی تھی اور جن کے بنائے ہوئے کچے گھڑے بھی اتنے مضبوط ہوتے تھے کہ عشق سمیت دریا پار اتر جایا کرتے تھے۔ یہیں حضرت شاہ جہانگیر صاحب، سید پاک کا مزار ہے، جس کے بارے میں وثوق سے کہا جاتا

ہے کہ وہاں قبر تو ہے مگر اس کے اندر کوئی دفن نہیں۔ نور جہاں نے وہاں شہنشاہ جہانگیر کی میت چند برس کے لیے امانتاً سپرد کی تھی اور جب لاہور میں اس کا مقبرہ مکمل ہو گیا تو میت وہاں منتقل کر دی گئی مگر لوگ نہیں مانتے۔ خالی پڑی ہوئی قبر پر اگر منتیں اور مرادیں پوری ہو جائیں تو کسی کو کیا؟

1849ء میں جب سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز فوج ان کا صفایا کرنے لگی تو انہوں نے اسی مزار میں پناہ لی اور اپنے بال کٹوا دیے۔ انگریزوں نے مزار پر گولی چلائی۔ مقامی باشندے آج تک کہتے ہیں کہ وہی گولیاں واپس آ کر انگریزوں کو لگیں۔ ان کی قبریں وہیں موجود ہیں مگر ان پر جھاڑ جھنکاڑ اُگ رہے ہیں اور سوئیٹی چر رہے ہیں۔

گجرات کے کاریگر کسی زمانے میں بہترین شمشیر بنایا کرتے تھے جس میں وہ سونے چاندی کے تار اُتارا کرتے تھے۔ یہیں کے لوگ اتنا عمدہ فرنیچر بناتے تھے کہ وہ ولایت تک جاتا تھا۔ اب وہ کاریگر نہیں رہے، وہ کمہار بھی خاتمے کے قریب ہیں۔ نئی نسل بجلی کے پنکھے بناتی ہے۔ وہ بھی ولایت تک جاتے ہیں۔

مگر گجرات کے معماروں نے رام پیاری کا جو محل بنایا تھا، اس کے آگے بمبئی کی فلموں کے سیٹ بھی شرما جائیں۔ نہایت حسین خاتون کے لیے کاریگروں نے اتنا ہی دلکش محل کھڑا کیا تھا۔ رام پیاری تقسیم ہند کے وقت چل بسی یا ہندوستان چلی گئی مگر گجرات میں اس کے محل کی دلکشی آج تک برقرار ہے۔ اب اس میں طالبات کا ہاسٹل ہے اور کس کی مجال ہے کہ گجرات کی خواتین کے حسن سے انکار کرے۔

لیکن ایک اور دیکھنے کی جگہ حضرت سید کبیر الدین شاہ دولہ دریائی گنج بخش کا مزار ہے جہاں زائرین کی دبی دبی سی قرأت میں چڑیوں کی چہکار مل کر عجب سکون آور احساس پیدا کرتی ہے۔

جس وقت میں وہاں پہنچا۔ مقبرے کے سامنے درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے بابا برکت علی اپنے پرانے ہارمونیم کی پھٹی پرانی دھونکنی کے ساتھ اتنے ہی پھٹے پرانے سُر ملا کر گانے میں محو تھے۔

"تیرے سوہنے مدینے توں قربان میں
للہ مینوں مدینے بلا۔
مرنے توں پہلے روضہ وکھا
سوہنیا۔"

یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے۔ بابا برکت علی کا یہ نغمہ ریڈیو پر نشر ہونے کے چند برس بعد مجھے سعودی عرب سے ایک بینک کے افسر کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ بینک کے منیجر نے پاکستان میں اپنے ماتحتوں کو ہدایت کی کہ گجرات کے بابا برکت علی کے مدینے کے سفر کی تیاری کی جائے۔ بابا کا پاسپورٹ بنا۔ عمدہ لباس تیار ہوا۔ وہ خیر سے مدینے گئے جہاں انہیں نہایت آرام دہ ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور پھر انہوں نے جی بھر کے روضہ دیکھا۔ خوب ہیں اس کے سوہنیا۔

اور یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ سعودی بینک کے منیجر صاحب نے کانپور میں پرانی قبروں کی نگرانی کرنے والی بڑی بی کے نواسے قائم رضا کی گفتگو بھی سنی جو اسکوٹر کی مرمت کا کام سیکھ رہا تھا اور جسے معلوم نہیں تھا کہ اسے اس کی محنت کا معاوضہ کب ملے گا اور وہ بھی کتنا۔

بینک منیجر نے بھارت میں اپنے ماتحتوں کو ہدایت کی کہ قائم رضا کو سعودی عرب بھیجنے کے انتظامات کیے جائیں۔ اس دوران اس کی سفری دستاویز تیار ہوئی اور کچھ عرصے بعد وہ سعودی عرب چلا گیا جہاں اس کی تعلیم ہوئی اور بینک میں ملازمت ملی۔ پھر اس کی شادی ہوئی اور ایک بیٹا بھی ہو چکا تھا۔

مولا جب آئیں گے تب آئیں گے۔ ان کی برکات اب بھی آتی ہیں۔

راہ میں وزیر آباد پڑا۔ اگر آپ کوئی ایسا شہر دیکھنا چاہیں جس کی ترقی رک گئی ہو تو وزیر آباد کو دیکھیں۔ کسی زمانے میں یہ پنجاب کا بہترین شہر کہلاتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے یہ شہر اپنے اطالوی جرنیل ابو طویلہ کو سونپ دیا تھا۔ اس نے جی لگا کر شہر کو بسایا۔ سیدھی سڑکیں، سیدھی گلیاں، گول چوراہے، گھنٹہ گھر اور آرائشی دروازے۔ مجھے اپنے سفر کے دوران ہوائی جہاز میسر نہ تھا ورنہ اوپر فضا میں جا کر دیکھتا۔ آج کمپیوٹر پر گوگل ارتھ (Google Earth) میں دیکھا۔ وزیر آباد ہی نہیں، اگلے پڑاؤ گوجرانوالہ میں بھی سڑکیں قرینے سے بنی نظر آتی ہیں۔ بس آج کے کمپیوٹر زدہ جوانوں نے اس میں اپنے اور یار دوستوں نے مکانوں اور کاروباروں کی نشاندہی کر کے سارا نقشہ ملیا میٹ کر دیا ہے۔

گوجرانوالہ کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ وہاں جا کر جی خوش ہوتا ہے۔ نہایت صحت مند اور ہنرمند لوگوں کا شہر ہے۔ سکھ چلے گئے ہیں مگر اپنی بے شمار نشانیاں چھوڑ گئے ہیں جن میں اب دینی مدرسے کھل گئے ہیں۔ رنجیت سنگھ جس مکان میں پیدا ہوئے تھے، وہ محفوظ ہے۔

یہیں ان کاریگروں سے ملاقات ہوئی جنہیں کوئی بھی ولایتی مشین دکھا دیجیے، وہ ہو بہو ویسی ہی مشین بنا دیں گے۔ مجھے وہاں میر عطا محمد صاحب سے ملنا ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس وقت اسی برس کے ہو رہے تھے مگر انہیں یہ اسی برس صاف تصویر کی طرح یاد تھے۔ بتا رہے تھے کہ ان کے زمانے میں خاک دھول اڑاتی ہوئی آندھی آتی تھی تو لوگ کہا کرتے تھے کہ کہیں کوئی قتل ہو گیا ہے۔ بعد میں یہ بات سچ نکلتی تھی۔ پھر بولے "اب تو روزانہ کئی قتل ہوتے ہیں۔"

آندھی نے تنگ ہو کر آنا ہی چھوڑ دیا۔

ایک رات کے لیے میں قریبی گاؤں سید نگر چلا گیا۔ بڑی پرسکون بستی تھی۔ میں ایک بڑے دالان میں بیٹھا تھا اور گاؤں کے چھوٹے بڑے میرے گرد حلقہ کیے بیٹھے تھے۔ اس رات فضا اتنی شفاف تھی کہ آسمان کا ایک ایک ستارہ صاف نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "اوہ، کتنے بہت سے ستارے ایک جگہ جمع ہیں۔"

ایک چھوٹی سی لڑکی بولی "وہ کہکشاں ہے۔"

شہر والے کیا جانیں قدرت کی ان نفاستوں کو۔ میری راہ میں جو اگلا شہر آنے والا ہے جس میں کبھی سحر سے زیادہ باغ تھے، بارہ دریوں، فواروں اور محلوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ وہاں راتوں کو کہکشاں ضرور نظر آتی ہوگی۔ اب تو ٹریفک کا دھواں اور اس میں خاک دھول کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس شہر کا نام ہے لاہور۔

مغلوں نے اسے آراستہ کیا۔ سکھوں نے بادشاہی مسجد میں گھوڑے باندھے اور اس کے میناروں پر توپیں چڑھا دیں۔ انگریزوں نے مسجدوں میں اذانیں بحال کرائیں اور اردو کی تعلیم شروع کی۔

ایک بات ماننی پڑے گی۔ راہ میں جس طرح وزیر آباد ہے جس کی ترقی رک گئی ہے، اس کے برعکس لاہور ہے۔ پشاور سے نکلتے تنگ راستے میں پڑنے والا یہ واحد شہر ہے جو مسلسل ترقی کر رہا ہے اور ترقی بھی ایسی کہ اس میں خوش ذوقی شامل ہے۔

میں نے اعلان کر دیا کہ بس اب کچھ اور نہیں دیکھنا۔

میرا سفر یہیں تمام ہوا۔

---------O---------

چند لمحوں کا یادگار انٹرویو

انیسویں صدی کی بھولی بسری کتابوں کو پرانے ذخیروں سے نکالنے اور ریڈیو پر پڑھ کر سنانے کا سلسلہ اپنے خاتمے کو پہنچا تو طے پایا کہ اس کی جگہ ایک نیا اور رنگارنگ پروگرام پیش کیا جائے۔ بی بی سی میں اکثر پروگراموں کے دو نام ہوا کرتے تھے۔ ایک انگریزی اور دوسرا اردو میں۔ اس نئے پروگرام کا انگریزی نام "سنڈے میگزین" قرار پایا۔ اردو میں اس کا نام "اتوار کے اتوار" رکھا گیا۔

اس پروگرام کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اس میں دنیا زمانے کی دلچسپ باتیں کی جائیں۔ طرح طرح کے موضوعات چھیڑے جائیں۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کو بلا کر ان سے گفتگو کی جائے اور چلتے چلتے کوئی بھولا بسرا نغمہ سنوا دیا جائے۔ میرے پاس پرانے گانوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ نغمے ایک خاص نسل کے سننے والوں کو لبھاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ دلی اسٹیشن کے اردو پروگرام میں صبح صبح پرانے نغمے نشر کیے جاتے تھے اور کراچی کے ہر گھر سے ان ہی گانوں کی آواز گونجا کرتی تھی۔ میرا ٹھکانہ کراچی ہی تھا۔

"اتوار کے اتوار" نام کے پہلے پروگرام کے لیے مجھے دو ایک چونکانے والے موضوعات کی تلاش تھی۔ یہ وہ دن تھے جب اردو کے ممتاز طنز نگار اور شاعر ابنِ انشاء اپنے علاج کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔ وہ "کتب خانہ" کے آخری پروگرام میں شریک بھی ہوئے۔ اگلے ہی ہفتے "اتوار کے اتوار" شروع ہونے والا تھا۔ ان سے طے پایا کہ جیسے انہوں نے برسہا برس اخباروں کے لیے کالم لکھے تھے، اب ریڈیو کے لیے ہفتہ وار کالم لکھیں۔ خیال نیا اور اچھوتا تھا۔ وہ آمادہ ہو گئے۔ ابنِ انشاء نے اپنی زندگی کا پہلا ریڈیائی کالم لکھا۔ کسے پتہ تھا کہ یہی ان کی زندگی کا آخری کالم ہوگا۔ ان کا مرض بڑھتا گیا اور وہ دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ کیسی روشنی تھی ان سے۔ کیسا اندھیرا ابھر گیا فضا میں۔

نئے اور پہلے پروگرام کی تیاری جاری تھی کہ ایک بڑی خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ اپنے وقت کے عظیم گلوکار محمد رفیع لندن آگئے ہیں اور یہاں ان کا بہت بڑا شو ہونے والا ہے۔ میں اچھل پڑا اور میں نے اعلان کر دیا کہ ہم رفیع صاحب کا انٹرویو نشر کریں گے۔

مگر کسی نے یہ کہہ کر میرے ولولے کو سرد کر دیا کہ محمد رفیع کبھی کسی کو انٹرویو نہیں دیتے۔ لوگوں نے بڑی کوشش کی لیکن انہوں نے ہر بار ٹکا سا جواب دے دیا۔ بتانے والوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ انٹرویو دینے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔ ہمیں اندازہ تھا کہ وہ امرتسر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی نوعمری کا زمانہ لاہور میں گزرا تھا۔

اب میرے ذہن میں بجلی کوندی۔ میں نے کہا کہ اپنے کسی انگریز ساتھی سے کہیں کہ وہ رفیع صاحب کو فون کرے اور انہیں انٹرویو کے لیے آمادہ کرے۔ انگریز کی آواز سن کر وہ یا تو یس (Yes) یا نو (No) کہیں گے۔ امکان یہی ہے کہ وہ یس کہیں گے کیونکہ اگر انہوں نے نو کہا تو انگریز انکار کا سبب پوچھے گا جس کے لیے ہمارے محمد رفیع کو انگریزی بولنی پڑے گی۔

فون کیا گیا جو رفیع صاحب نے نہیں بلکہ ان کے ایک عزیز نے اٹھایا جو شاید ان کے بہنوئی تھے۔ انگریزی شاید ان کی بھی واجبی تھی۔ انہوں نے Yes کہہ دیا۔

میں اپنا ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر ان کے ہوٹل کی طرف لپکا۔ ہندی سروس کے بھی ایک صاحب میرے ساتھ ہو لیے اور ذرا سی دیر میں ہم نے وسطی لندن میں ایک بڑے ہوٹل میں رفیع صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ان کے بہنوئی نے دروازہ کھولا۔ ہمارے عین مقابل ایک کرسی پر محمد رفیع بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ کچھ ایسا تبسم تھا جس میں بھول پن، سادگی اور کچھ گھبراہٹ شامل تھی۔

ہمارا تو خیال تھا کہ اہلِ پنجاب کی طرح وہ بڑے تپاک سے اور گرم جوشی سے ملیں گے۔ خوب باتیں ہوں گی، قہقہے بلند ہوں گے اور بڑا مزہ آئے گا۔

وہ مزہ کہاں سے آتا۔ انہیں تو چپ لگی ہوئی تھی جسے وہ اپنی عجیب سی مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی طرف سے ساری گفتگو ان کے بہنوئی کر رہے تھے اور اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ جلدی ختم کیجیے۔ میرا ہندی سروس والا ساتھی میری آڑ میں تھا۔ انٹرویو کرنے کی پہلی باری میری تھی۔ ٹیپ ریکارڈر تیار کرنے کے دوران میں نے پوچھا "آپ کیسے ہیں؟"

انہوں نے کچھ جواب تو دیا جو یہی ہوگا کہ ٹھیک ہوں۔ آپ کی دعا ہے یا اللہ کا شکر

ہے۔ جو بات سمجھ میں آئی، وہ یہ تھی کہ عابدی صاحب! یہ اللہ کا بندہ ویسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اب انٹرویو کیسے ہوگا؟

انٹرویو شروع ہوا۔ رفیع صاحب کے بہنوئی جا کر ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے پہلا سوال کیا کہ برطانیہ میں آپ نے جو شو کیے، ان میں سننے والوں نے آپ کا کیسا خیر مقدم کیا؟

رفیع صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے ان کے بہنوئی نے کہا "بہت اچھا کیا۔ بہت اچھا رسپانس ملا۔ پبلک بہت خوش ہوئی۔"

اب رفیع صاحب نے وہی جملہ دہرایا۔ "بہت اچھا کیا۔ اتنا رسپانس اچھا ملا۔ پبلک اتنی خوش ہوئی۔ بہت!"

جملہ اچانک ختم ہو گیا۔ اس طرح کی گفتگو کو طویل کرنے کی میری ہر کوشش ناکام رہی۔ وہ مختصر سا جواب دیتے۔ وہ ساری عمر دوسروں کے لیے پلے بیک کرتے رہے۔ اس وقت ان کے بہنوئی پلے بیک کر رہے تھے۔ چار منٹ بعد میں نے شکریہ کہہ کر اپنا ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا اور ہندی سروس والے کے لیے جگہ خالی کر دی۔

انٹرویو کے دوران میں نے رفیع صاحب سے پوچھا کہ جب آپ پہلے پہل گانے کے لیے مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے تو کچھ ڈر لگا تھا؟ جواب میں سب سے لمبا جملہ بولے۔ کہنے لگے کہ شروع شروع میں تو کچھ جھجک ہوتی ہے۔ بعد میں ڈر نکل جاتا ہے۔

ظالم نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی۔ جس وقت ہندی سروس والے نے انٹرویو شروع کیا رفیع صاحب کی جھجک نکل چکی تھی۔ اب کے انہوں نے کسی کی مدد کے بغیر جواب دیے اور ان جوابوں کی غالباً انہیں مشق تھی کیونکہ اس بار سوال ان کی سوانح عمری کے بارے میں تھے۔ وہ بتانے لگے کہ امرتسر کے قریب ایک گاؤں کوٹلہ سلطان میں پیدا ہوئے۔ جوانی لاہور میں گزاری وغیرہ وغیرہ۔

گانے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں رفیع صاحب نے واقعہ سنانا شروع کیا کہ ان کے گاؤں میں ایک فقیر گاتا ہوا آتا تھا۔ اس کا گانا انہیں اتنا پسند تھا کہ رفیع دور تک اس کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔

ابھی بات یہاں تک پہنچی تھی کہ انٹرویو کرنے والے صاحب نے بات کاٹ کر اگلا سوال کر دیا۔ بس اس کے بعد رفیع زیادہ نہ بول سکے البتہ بیچارے اپنی سی کوشش کرتے رہے۔

وہ منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا جب ان سے اپنا پسندیدہ گانا گا کر سنانے کی فرمائش کی گئی۔ لوگ اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ گاتے گاتے ان کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا اور چہرہ سرخ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ان کے بہنوئی نے یا وہ صاحب جو بھی تھے، ہاتھ کے اشارے سے محمد رفیع کو گانے سے روک دیا۔

اگلے دن لندن کے رائل البرٹ ہال کے اسٹیج پر دیکھا۔ محمد رفیع گا رہے تھے: ''انصاف کا مندر ہے یہ بھگوان کا گھر ہے'' اور پہاڑ جیسے بڑے ہال کے درو دیوار لرز رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ بچپن میں رفیع کا پیار کا نام پھیکو تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ بات کرتے ہوئے وہ پھیکو ہوتے تھے اور گاتے ہوئے ان کے اندر سے ایک شخص نکل کر باہر آتا تھا جس کا نام رفیع تھا۔ محمد رفیع!

میں نے کتنے لوگوں کو انٹرویو کیا، شمار کرنا مشکل ہے۔ ان کے نام گنوانا اور بھی دشوار ہے۔ بعض لوگوں کی گفتگو اور بات چیت کا انداز آج تک یاد ہے لیکن اکثر کو بھول گیا ہوں۔ ڈائری رکھی ہوتی تو یوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ کہہ سکتا ہوں سب سے دلچسپ گفتگو کون کرتا ہے۔ وہ تھے اپنے وقت کے مشہور قوال غلام فرید صابری۔ اس قدر پر لطف باتیں کرتے تھے کہ سارا وقت ہنستے ہنستے گزر جاتا تھا۔ سب سے مشکل ثابت ہونے والوں میں محمد رفیع مرحوم کا ذکر تو ہو چکا، ان کے علاوہ ایک اور بڑے گلوکار مہدی حسن نے بھی ستایا۔ ان کی عجیب خصوصیت یہ تھی کہ چائے کی پیالی پر نہایت عمدہ گفتگو کرتے تھے لیکن مائیکروفون کے سامنے انہیں چپ لگ جاتی تھی۔

مہندی حسن لندن آئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی ایک طویل گفتگو ریکارڈ کر کے محفوظ کر لی جائے۔ اس کے لیے بڑی تیاری کی گئی۔ ان کے نمائندہ گانے نکالے گئے اور طے یہ پایا کہ ہر گانا بجا کر اس کے بارے میں ان سے بات کی جائے گی۔ انٹرویو سے پہلے ان سے گفتگو ہوئی اور فیصلہ ہو گیا کہ ان سے کیا کیا پوچھا جائے گا لیکن جب ریکارڈنگ شروع ہوئی تو بالکل یوں لگا کہ جو باتیں وہ بی بی سی کی کینٹین میں کہہ چکے تھے، انہیں دہرانے سے گریز کر رہے تھے۔ ایسا بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو گفتگو وہ پہلے کر چکے ہیں، اسے دہرانا معیوب لگے گا۔

موسیقی کی دنیا سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں نے جی کو خوش کرنے والی باتیں کیں ان میں موسیقار اعظم نوشاد علی سرفہرست ہیں۔ نہایت روانی سے بولتے تھے۔ لب ولہجہ انتہائی مہذب تھا اور لاکھ بمبئی میں رہے ہوں، لکھنؤ ان کے اندر جوں کا توں موجود تھا۔ مصلحتوں اور نزاکتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لتا منگیشکر نے محمد رفیع کے خلاف کیسا محاذ کھڑا کیا تھا، صاف ٹال گئے۔ طلعت محمود سے خود نوشاد صاحب کا اختلاف کس بات پر تھا، جواب دیتے ہوئے پہلو بچا کر نکل گئے۔ البتہ فلم کی دنیا میں کس کس کو اور کیسے لائے، اس کی تفصیل مزے لے لے کر سناتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ میری باتوں سے یہ نہ سمجھئے گا کہ ان سب کو میں نے متعارف کرایا۔ بعض گانے والوں کے لیے ان کا یہ جملہ ایک سے زیادہ بار سننے میں آیا کہ انہوں نے میرے لیے گایا، ان کی شہرت تو پہلے ہی بہت تھی، میری عزت بڑھ گئی۔

ایک بار میں نوشاد صاحب کا انٹرویو ریکارڈ کرنے بیٹھا، بات سے بات نکلتی گئی۔ تب کسی نے ٹوکا کہ ایک گھنٹہ گزر چکا ہے اور نوشاد صاحب کو کہیں جانا ہے۔ طے یہ پایا کہ ابھی تو بہت سی باتیں رہ گئی ہیں، لہٰذا میں بمبئی جاؤں اور گفتگو مکمل کروں۔ اس کی نوبت نہ آئی اور وہ چل بسے۔

محمد رفیع کے بڑے مداح تھے۔ ان کے انتقال پر ایک قطعہ کہا تھا جس میں رفیع کو موسیقی کا پیمبر قرار دیا تھا۔ رفیع صاحب پہلی بار ان سے کیسے ملے اور ان کا پہلا گانا کس طرح ریکارڈ ہوا، اس کی تفصیل بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ثریا سے، جب وہ بے بی ثریا تھیں، ایک لڑکے کا گانا کیسے گوایا۔ اوما دیوی موسیقی کی دنیا میں کیسے آئیں، ساری باتیں انہیں ازبر تھیں۔

کندن لعل سہگل کی بات کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے تھے۔ جو لوگ بڑے تھے، ان کے بڑے پن کا بڑے کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے۔ ہر انٹرویو کے شروع میں سننے والوں کو آداب ضرور کرتے تھے۔

بنا بنایا مرقع تھے لکھنؤ کا

بی بی سی اردو سروس کا پروگرام سب رس بہت عرصے سے چل رہا تھا۔ شروع میں اسے اطہر علی پیش کیا کرتے تھے جن کا پروگرام کھیل کے میدان سے بہت مقبول تھا۔ سب رس ثقافتی پروگرام تھا اور اس میں نثری اور شعری ادب، مصوری، ڈراما، میلے ٹھیلے اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں کا تذکرہ رہتا تھا۔ اطہر صاحب کے بعد سب رس کئی برس میں نے پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

لندن میں اردو مرکز کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اردو مرکز سے ملتا جلتا ایک ادارہ کسی زمانے میں لاہور میں تھا۔ جب لندن میں آغا حسن عابدی کا مشہور بینک بی سی سی آئی قائم ہوا اور اس کی شاخ کے طور پر تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن وجود میں آئی تو الطاف گوہر اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ انہوں نے اردو مرکز کھولا اور افتخار عارف کو اس کا نگران مقرر کیا۔ اس ادارے کو بی سی سی آئی کے وافر وسائل مہیا تھے۔ چنانچہ زبان و ادب کے میدان میں اس نے خوب دھوم مچائی۔ اس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ لندن میں شاعروں ادیبوں کا آنا جانا معمول سا بن گیا۔ برصغیر سے امریکہ یا کینیڈا جانے والے اہلِ ادب کے راستے میں لندن پڑتا تھا اور وہ سب یہاں اترتے تھے اور ان کے اعزاز میں محفلیں ہوتی تھیں۔

پروگرام سب رس میں ان میں سے اکثر شاعروں، ادیبوں کی شرکت ضرور ہوتی تھی اور ہر ہفتے ایک نہ ایک شخصیت کا انٹرویو یقیناً شامل ہوتا تھا۔ میں نے جتنی خواتین اور حضرات کو انٹرویو کیا۔ ان کی فہرست ترتیب دینا مشکل ہے لیکن کچھ نام ذہن میں محفوظ ہیں۔ آلِ احمد سرور، علی سردار جعفری، جمیل جالبی، حبیب جالب، ممتاز حسین، محسن بھوپالی، گوپی چند نارنگ، ظ انصاری، انتظار حسین، شمس الرحمان فاروقی، گیان چند جین، جمیل الدین عالی، وزیر آغا، قتیل شفائی، قمر رئیس، فرمان فتح پوری، کرامت اللہ غوری، جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر، جمیلہ ہاشمی، عبید اللہ علیم، کشور ناہید، ممتاز مفتی، ابن انشاء، احمد فراز، شان الحق حقی، قدرت اللہ شہاب اور احمد ندیم قاسمی کے نام حافظے سے نہیں جانے کے۔

اسی طرح فلم اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے کتنے ہی سرکردہ افراد سے گفتگو ہوئی۔ مذہبی رہنماؤں اور علمائے دین نے بھی سب رس کو رونق بخشی۔ البتہ ایک نام ایسی شخصیت کا ہے جسے بی بی سی کی نشریات سے والہانہ لگاؤ تھا اور کوئی قابلِ ذکر پروگرام نشر ہوتا تو وہ شخص اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر خط ضرور لکھتا تھا اور وہ تھے ہمدرد شفا خانے کے بانی حکیم محمد سعید مرحوم۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ کیسا وقت آگیا ہے حکیم سے مراد نسخے لکھنے والا شخص لیا جاتا ہے۔

یہ سب لوگ یوں آئے تھے جیسے زندگی کے دریچے سے شگفتہ ہوا کا جھونکا چلا آتا ہے اور پنکھڑیاں چھوڑ جاتا ہے۔

----------O----------

دریا کی گواہی

14 اگست 2010ء۔

پورے تریسٹھ برس ہوئے، آج کے روز میں نے دنیا کے نقشے پر پاکستان کو ابھرتے دیکھا تھا۔

پورے تریسٹھ برس بعد آج کے دن پاکستان کی سرزمین کو بکھرتے ہوئے دریائے سندھ کی طغیانی میں ڈوبتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

سندھ کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ راتوں کی خاموشی میں اسے چپ چاپ دبے پاؤں بہتے دیکھا ہے۔ اسے چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ساحلوں کو رخساروں کی طرح تھپتھپاتے بھی دیکھا ہے۔ اس کی موجوں پر چاندنی میں روپہلی مچھلیوں کو اچھلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور لوگوں کو اس کی سوکھی پڑی ہوئی خاک کو چھانتے ہوئے بھی دیکھا ہے کہ اس میں کہیں سے سونے کے ذرے بھی بہتے ہوئے آجاتے ہیں۔

کیسا دریا ہے جو دینے پہ آجائے تو دیکھتے دیکھتے سرزمینوں کو سیراب کر ڈالے اور مٹانے پہ تل جائے تو راہ میں آنے والی ہر ذی روح کو تہ و بالا کرتا چلا جائے۔

ایسے دریا کی انگلی تھام کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنے کا شرف مجھے یوں ملا کہ برصغیر کا سفر اختیار کر کے میں ''کتب خانہ'' اور ''جرنیلی سڑک'' کے عنوان سے دو پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ ریڈیو پر اس طرح کے دستاویزی فیچر نشر کرنے کا تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ بی بی سی نے مجھے تیسرے سفر پر بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔ معاشروں کو آباد کرنے والی ایک بڑی شاہراہ یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ کی مسافت سے ذہن میں فطری طور پر خیال ابھرا کہ تہذیبوں اور تمدن کو زندگی عطا کرنے میں وہ کام سڑکیں نہیں کرتیں جو کام دریا انجام دیتے آئے ہیں تو کیوں نہ ایسی سرزمین میں تمدن کے گہوارے کو سیراب کرنے والے دریائے سندھ کے

کنارے کنارے چل کر اس کے قدموں کی چاپ سنی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ قدم اپنے کیسے کیسے نشان چھوڑ گئے ہیں، کیسی کیسی یادگاریں آج تک باقی ہیں اور تاریخ کے قافلوں کا مشاہدہ کرنے والی یہ نشانیاں کیونکر اپنی داستانیں سناتی ہیں۔

چنانچہ طے پایا کہ میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے چلوں اور یہ جانتے ہوئے کہ دریا چپ رہتے ہیں، اس سے سوال کروں، پوچھ گچھ کروں، اس کا بیان سنوں اور اصرار کروں کہ وہ شہادتیں دے۔

ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ بول اٹھا۔

میرا پروگرام ''شیر دریا'' اس دریائے سندھ کی گواہی ہے۔

طے یہ پایا کہ میں گرمیوں میں اوپر پہاڑی علاقے دیکھوں اور سردیوں میں نیچے میدانوں کا سفر کروں۔ چنانچہ میں سنہ 1990ء کی گرمیوں میں دلی سے چل کر سرینگر پہنچا جہاں سے مجھے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہمالیہ پار کر کے لداخ پہنچنا تھا اور دیکھنا تھا کہ حالات اور سیاست مجھے دریائے سندھ کے کنارے کہاں تک جانے کی اجازت دیتے ہیں۔

دلی اور سرینگر میں میرے احباب نے مجھے یہ خوشخبری سنادی کہ لداخ میں ایک صاحب ملیں گے جو نہ صرف اس سرزمین کے چپے چپے سے بلکہ وہاں کے تاریخی پس منظر، رسم و رواج، تہذیب وتمدن اور لوگوں کے مزاج سے واقف ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بلا کے مہمان نواز اور غضب کے مددگار ہیں۔ وہ میرے سارے مسئلے حل کر دیں گے۔

کسی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ بی بی سی کی اردو نشریات کے مداح ہیں اور مجھے یوں جانتے ہیں جیسے میں ان ہی کے گھرانے کا کوئی فرد ہوں۔

میں سنتا آیا تھا کہ سفر کا قصد نیک ہو تو مسافر نواز بہتیرے مل جاتے ہیں۔ اب یہ کہاوت سچ ثابت ہونے والی تھی کیونکہ میں سرینگر میں ریڈیو کشمیر کی نشرگاہ میں داخل ہو رہا تھا جس کے نگراں مسٹر لسی کول سے ملنا تھا۔ وہ میرے ہی منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ صبح کے وقت ریڈیو اسٹیشن کے پورے عملے کا جو اجلاس ہوتا ہے، میں اس میں شرکت کروں۔ کسی دوسرے اور غیر ادارے کے معاملات زیر بحث ہوں تو وہاں اجنبی بن کر بیٹھنا عجیب سا لگتا ہے مگر وہاں تو معاملہ ہی مختلف نکلا۔ یوں لگا کہ لسی کول نے وہ میٹنگ میری ہی خاطر بلائی تھی۔ انہوں نے میرا تعارف کرانے کے بعد

کہا کہ عابدی صاحب، آپ ہمیں بتایئے کہ آپ کس مشن پر نکلے ہیں۔ میں ٹھہرا ریڈیو کا آدمی، لمبی تقریر کرنے کا قائل نہیں۔ میں نے مختصر طور پر بتایا کہ دریائے سندھ کے موضوع پر دستاویزی پروگرام ترتیب دینے کے لیے نکلا ہوں اور دریا کے کنارے کنارے لداخ سے اپنا سفر شروع کرنے جا رہا ہوں۔

سب ہی خوش ہوئے۔ لس کول صاحب نے ظاہری نہیں حقیقی نیک نیتی کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دوں، ایک گوشے سے ایک نسوانی آواز آئی "سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی سرزمین دکھانے کے لیے عابدی صاحب کے ساتھ چلی جاؤں؟" میں نے جھک کر دیکھا۔ وہی لداخی ناک نقشے والی، ذہین اور ہونہار خاتون تھیں جن سے میں واقف نہ تھا۔ ان کا سوال سننے کے بعد سارے عملے کی نگاہیں کول صاحب کی طرف گئیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں گی کہ فیصلے آن واحد میں بھی ہوا کرتے ہیں۔ انہوں نے جھٹ کہا "تمہیں میری منظوری حاصل ہے۔"

وہ خاتون ریڈیو کشمیر کی براڈکاسٹر تسرنگ اُنگ مو تھیں جو لداخ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا گھرانہ وہیں علاقے کے صدر مقام لیہ (بروزن دیہہ) میں تھا اور جو بعد میں لیہ کی لداخی نشر گاہ کی سربراہ ہو کر وہیں چلی گئی تھیں۔ بعد میں تو یہ بھی ہوا کہ شدت پسندوں نے کول صاحب کو گولی ماردی اور ماں باپ کو اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم کر دیا۔

اگلی ہی صبح کی پرواز کے لیے میں اور تسرنگ انگمو سرینگر ہوائی اڈے کے اس مجمع میں شامل ہو گئے جو لداخ جانے والے طیارے کا بورڈنگ پاس حاصل کرنے کے ہزار جتن کر رہا تھا۔ لداخ جانے والے طیارے کا معاملہ یوں ہے کہ اسے فضا میں بہت اوپر جا کر کوہ ہمالیہ کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ موسم صاف ہو تو یہ کام نسبتاً آسان ہے اور صاف نہ ہو تو پھر ہواباز کی جرأت پر منحصر ہے کہ وہ طیارہ لے جائے گا یا نہیں۔ باقاعدگی سے آنے جانے والے لوگوں کو ہوابازوں کے نام زبانی یاد تھے۔ مثلاً اصغر کیسا ہی موسم ہو، طیارہ لے جاتے ہیں البتہ اشوک انکار کر دیتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ موسم کو دیکھتے ہوئے طیارے کے وزن کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ موسمی حالات اچھے ہوں تو جتنی نشستیں ہیں، اتنے ہی مسافر بٹھائے جاتے ہیں اور اگر موسم کے تیور ٹھیک نہ ہوں تو کتنی ہی نشستیں خالی جاتی ہیں۔ مجھے نہیں پتا کیسے مگر تسرنگ انگمو مجمع میں جا کر دو بورڈنگ پاس لے آئیں۔ اب طیارے میں نشستیں ملنا یقینی تھا۔ ذرا دیر بعد طیارہ اڑا، دیر تک بادلوں میں

اڑا۔ پھر بادلوں سے بھی اونچا ہوا۔ اس کے بعد ہمالیہ سے بھی زیادہ بلند ہوا اور اس علاقے میں داخل ہو گیا جہاں بادل نہیں جا سکتے۔

اس علاقے کا نام ہے لداخ!

لداخ کو جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ خشک پہاڑ سوکھی ہوئی وادی، ٹیلوں پر پھسلتی ہوئی ریت، ہر طرف پتھر، چٹانیں اور بے آب و گیاہ پہاڑیاں۔ ان سب کے بیچ تھوڑے سے پانی کی چھوٹی سی گزرگاہ جیسے کہیں سے بہہ کر چلا آنے والا چشمہ ہو جسے یہ معلوم نہ ہو کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہی تھا ہمارا شیر کا بچہ جو آگے وادیوں میں اترتے اترتے تند و تیز شیر بن جائے..... شیر دریا۔

لداخ والوں نے بتایا کہ دریائے سندھ تبت میں ایک چھوٹے سے چشمے کی شکل میں پھوٹتا ہے اور شمال کی طرف بہتا جاتا ہے اور لداخ سے گزر کر اسکردو پہنچتے پہنچتے دریا کی شکل دھار لیتا ہے۔ پرانے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو اپنی زبان میں سنگھے کھب کہتے تھے یعنی شیر کا دہن۔ مجھے یقین ہے کہ یہی سنگھے بعد میں سنگھ ہوا اور بالآخر سندھ کہلایا۔

اس سندھ کو مرحلۂ شباب میں داخل ہونے سے پہلے دیکھنے کی خاطر میرا لداخ جانا ضروری تھا۔ میں وہاں پہنچا اور ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو ایک صاحب بڑھ کر مجھ سے بغلگیر ہو گئے اور بولے "میرا نام اکبر لداخی ہے۔"

اکبر لداخی بڑے کام کے آدمی نکلے۔ اول تو اپنے علاقے کے بارے میں معلومات کا انبار لگا دیا، دوسرے مجھے پورے علاقے میں گھمانے لے گئے۔ لداخ کی ملی جلی ثقافت کے بارے میں خود اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میری ماں بودھ ہیں، میری بیوی سنی ہیں اور میں خود شیعہ خاندان سے ہوں۔

وہیں لداخ کے ایک بزرگ کلونگ رگزی ننگل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت عمدہ اردو میں باتیں کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ پہلے زمانے میں ہر مذہب کے لوگ ہمیں ہدایت کرتے تھے کہ آپ دریا کے پانی میں ہاتھ نہ دھوئیے۔ نیچے کہیں کوئی اس پانی کو پینے والا بھی ہوگا۔ ہمارے بچپن کے زمانے تک لوگ کسی برتن میں نالے (یعنی دریائے سندھ) کا پانی نکالتے تھے اور ذرا دور سوکھی زمین پر پیتے تھے اور وہیں ہاتھ دھوتے تھے مگر اب تو لوگ اس میں اپنے گندے کپڑے دھوتے ہیں۔

میں تبت کی سرحد تک جانا چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دریا کا نظارہ کرلوں لیکن غیرملکیوں کو وہاں تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس علاقے میں بھارت کی فوج تھی جو اپنے ہتھیاروں کے استعمال کی مشق کیا کرتی تھی۔ جب میں چھوٹے سے گاؤں اُپشی میں چرواہوں کے انٹرویو ریکارڈ کررہا تھا،ان کے ساتھ توپ کے گولوں کی گھن گرج بھی ریکارڈ ہورہی تھی۔

اُپشی سے چل کر، قدم قدم پر بودھ راہبوں کی خانقاہیں اور دوسری نشانیاں دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک مقام ایسا آیا جہاں یہ چھوٹا سا دریا گہرائی کی بجائے سطح زمین کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ وہاں ہریالی نظر آئی، کھیت دکھائی دیے جن کے درمیان ایک گاؤں اور اس میں مسجد کے گنبد نظر آئے، مکتب کے حجرے دکھائی دیے اور حضرت عباسؓ کا علم اور پھریرا لہراتا دکھائی دیا۔

اس بستی کا نام چھی شوت تھا جس کے باشندوں سے مل کر جی خوش ہوا، سب کھیتی باڑی کررہے تھے اور سب تعلیم پا رہے تھے۔

ذرا آگے چلے تو لداخ کی مشہور گلوکارہ سی شولاموں سے ملاقات ہوئی۔ انہیں سنگیت ناٹک اکیڈمی کا بڑا ایوارڈ ملا ہے لیکن پہلے وہ بھکارن تھیں۔ گھر گھر جا کر اور گانا گا کر بھیک مانگا کرتی تھیں مگر ہندوستان کی تہذیب کا پلّہ بھاری رہا۔ آج ان کے گلوکاری کے فن کو سراہا جارہا ہے۔

لیہ کی جامع مسجد مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کا آدھا حصہ مغلوں کے زمانے کا اور آدھا حصہ جدید دور کا ہے۔ صاف ستھری، کشادہ، روشن اور خوش نما عمارت۔ فرش کے نیچے آگ جلا کر اسے گرم رکھا جاتا ہے۔ اس پر ترکستان سے آئے ہوئے قالین بچھے ہیں۔ فرش کی حرارت مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، آس پاس کے لوگوں نے حلقہ کرلیا اور دیر تک گھل مل کر باتیں ہوتی رہیں۔

لیہ سے آگے چل کر جہاں تک ممکن تھا میں گیا۔ آگے بلتستان تھا۔ اسکردو تھا۔ پاکستان تھا لیکن مجھے سرحد پار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے دریا کا ساتھ چھوڑنا بھی منظور نہ تھا، لہٰذا پھر کسی دلیر ہوا باز نے اپنا طیارہ لیہ میں اتارا۔ میں دوبارہ سرینگر اور وہاں سے دلّی پہنچا۔ فوراً ہی اسلام آباد کی پرواز پکڑی۔ وہاں بھی کوئی جراَت مند ہواباز طیارے کو اسکردو لے گیا۔ جس سے لگا لگا میرا جانا پہچانا دریا مجھے دوبارہ مل گیا۔ اس روز شہر اسکردو یوں لگا جیسے ایک کشادہ پیالے کی تہ میں

کوئی موتی پڑا ہو۔

مجھے بتایا گیا کہ یہ آپ کا علاقہ ہے جہاں جی چاہے جائیے۔ فوج آپ کو نہیں روکے گی۔
لداخ کے بعد اسکردو آ کر یوں لگا جیسے کسی پرانے زمانے کے انسان کو اٹھا کر جدید زمانے میں اتار دیا جائے۔ اسکردو دنیا سے الگ تھلگ اور کٹا ہوا علاقہ تھا۔ اب نہیں ہے، کراچی کی بندرگاہ سے باربردار ٹرک چل کر اسکردو پہنچ جاتے ہیں اور یہ شاندار سڑک سال کے بارہ مہینے کھلی رہتی ہے۔

سڑک کے ساتھ زمانے کی زیادہ تر نعمتیں اس علاقے میں پہنچ گئی ہیں اور یہاں پیدا ہونے والی بے مثال خوبانی جو کثرت سے پیدا ہوتی تھی اور درختوں سے گر کر سڑ جاتی تھی، اب خشک کر کے دنیا بھر میں پہنچائی جا رہی ہے۔ اسی طرح جدید تعلیم بڑے سلیقے سے اس سرزمین پر آ گئی ہے۔ میں کئی لڑکیوں سے ملا جو خوب پڑھ لکھ گئی تھیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نیچے شہروں میں جانے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔ ان سے ان کے استادوں نے کہا کہ تم چلی جاؤ گی تو بلتستان کی لڑکیوں کو کون پڑھائے گا؟ چنانچہ وہ یہیں ٹھہر گئیں اور اب علم کے چراغ گھر گھر روشن ہو رہے ہیں۔

بس ایک غضب ہوا۔ ماضی کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے پورے ملک میں تعلیم عام کرنے کے لیے نئی روشنی کے نام سے بے شمار اسکول کھول دیے تھے۔ یہ نظام چل نکلا تھا اور بلتستان کی سڑکوں پر وقت ضائع کرنے والے ہزاروں بچے جماعتوں میں جا بیٹھے تھے۔ یہ صورتحال وہاں اوپر پہاڑوں پر تھی جہاں کے نیک صفت باشندے دیانتداری سے نئی روشنی کی لو اونچی کر رہے تھے لیکن نیچے میدانوں میں یہ ہوا کہ نئی روشنی کے تعلیمی نظام میں بلا کی بدعنوانی اور بددیانتی شروع ہو گئی جو اتنی بڑھی کہ حکام نے نئی روشنی کی پوری بساط لپیٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی زد میں آ کر بلتستان کے اسکول بھی بند کر دیے گئے اور نہ صرف سیکڑوں اساتذہ بلکہ ہزاروں بچے بھی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

میدانوں کی سیاست کا کوڑا کباڑ محمد خان جونیجو پر بھی گرا۔ وہ کھڑے کھڑے برطرف کر دیے گئے اور ان کے شروع کیے ہوئے سارے ترقیاتی منصوبے یوں بند کر دیے گئے جیسے بجلی کا ایک ذرا سا بٹن دبانے سے لمحہ بھر میں روشنی بجھ جایا کرتی ہے۔

جگہ جگہ لگے ہوئے "نئی روشنی" کے بورڈ سیاست کی غلاظت کا ماتم کرتے رہ گئے۔ انہیں

سازشیں کر کے نکلوا دینے والوں کے کشادہ ماتھوں پر ندامت کے پسینے کا ایک قطرہ بھی نمودار نہ ہوا۔

میں اسکردو سے چلا۔ پہاڑی سڑک جو شاہراہ قراقرم کہلاتی ہے، اونچی ہوتی گئی۔ دریا گہرائی میں چلا گیا۔ راہ میں چھوٹے چھوٹے دیہات سے لے کر بڑے بڑے آبشاروں تک کیا نہیں ملا۔ یہاں تک کہ ننگا پربت آ گیا جو شفاف فضا کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دوسرے دریا گر کر دریائے سندھ کے آنچل میں سما رہے تھے۔ جگہ جگہ ان فوجی انجینئروں کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں جو یہ سڑک بناتے بناتے موت کی وادیوں میں جا گرے تھے یا ہلاکت کی چٹانیں لڑھکتی ہوئی ان کے اوپر آ گری تھیں۔

راہ میں چلاس آ گیا۔ کبھی پسماندہ رہا ہوگا۔ اب شاہراہ قراقرم کے فیض بتوں کر ترقی کر چکا تھا۔ لوگ خوش تھے۔ ان کے علاقے میں بڑے بڑے ہوٹل کھل گئے تھے۔ ٹریفک چل رہا تھا اور کاروبار چمک رہا تھا۔ ساری آبادی بی بی سی سنتی تھی۔ ہر شخص مجھے جانتا تھا۔ یہاں اونچے پہاڑوں کے علاقے میں اپنے اجنبی ہونے کا احساس جاتا رہا۔ میں نے اپنے پروگرام کے لیے بہت سے انٹرویو ریکارڈ کیے اور ان سے بھی زیادہ محبت سمیٹی۔

مگر جو انٹرویو مجھے یاد رہے گا وہ ڈاکٹر یاسمین ممتاز کا تھا۔ اصل میں تو وہ علاقے کے ڈپٹی کمشنر کی اہلیہ تھیں مگر کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج میں تعلیم پا چکی تھیں۔ اس علاقے میں آئیں تو دیکھا کہ پردہ دار اور باحیا خواتین کو مر جانا منظور ہے مگر مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا گوارہ نہیں۔ اوپر سے غضب یہ کہ سردی کی وجہ سے بار بار نہانا ممکن نہیں، لہٰذا غلاظت کی وجہ سے بیمار رہتی ہیں اور گھر گرہستی کی ذمہ داریاں اٹھاتے اٹھاتے ان کے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر یاسمین ممتاز نے ان کا علاج شروع کیا تو مریض خواتین کی قطاریں لگ گئیں۔ میں نے کسی ڈاکٹر کو خلق خدا کی اتنی خدمت کرتے (ابھی تک) نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے علاقے کی عورتوں کے بارے میں آنکھیں کھول دینے والی تفصیلات بتائیں (اور ایک بار مجھے کراچی میں آغا خان میڈیکل کالج کے طالب علموں سے خطاب کرنے کا موقع ملا تو یہی تفصیلات میں نے انہیں بھی بتائیں۔ کسی طالبہ نے آ کر مجھ سے یہ نہیں کہ میں بھی اس علاقے میں جانے کی خواہش مند ہوں۔)

چلاس سے آگے چلے تو کوہستان کا علاقہ آ گیا۔ پہاڑ تو ویسے ہی تھے، دریا بھی ویسا ہی تھا البتہ لوگوں کی آنکھوں میں چھپی ایک وحشت سی تھی۔ یہاں سڑک تو آ گئی ہے مگر وہ تہذیب نہیں آئی جو انسان کو ذرا ملائم بنا دیتی ہے۔ جن دنوں میں صدر مقام داسو میں پہنچا وہاں ایک قتل ہو چکا تھا

جو اصل میں چالیس سال پہلے ہونے والے ایک قتل کا انتقام تھا۔

"داسو میں تعلیم کا کیا حال ہے؟" میں نے ان لوگوں سے پوچھا۔ پتا چلا کہ جو دوسرے علاقے سے آئے ہوئے لوگ یہاں آباد ہیں، ان کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ لڑکیوں کا ایک اسکول بھی ہے۔ اس میں دو سو کی گنجائش ہے اور طالبات کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں۔

علاقے میں جرائم بالکل نہیں (انتقام کو وہ جرائم نہیں مانتے) لوگ راہگیروں کو نہیں لوٹتے۔ چوری بالکل نہیں کرتے لیکن اگلے پڑاؤ پر سنا کہ بس ایک عیب ہے، جھوٹ بولتے ہیں۔

میری پہلی بھول

آگے پٹن تھا مگر کہاں تھا؟ میں نے گردن اٹھا اٹھا کر بہت دیکھا۔ شہر نظر نہیں آیا اور آتا بھی کیسے۔ یہ واحد شہر تھا جو بلند سڑک کے کنارے نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹی سڑک اتر کر نیچے دریا تک جاتی تھی۔ پٹن وہاں تھا۔

دریا سے لگی لگی آبادی دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شیر جیسے دریا میں طغیانی آجائے تو یہ سوکھے تنکے کی طرح بہہ جائے گا۔ لوگوں نے بتایا کہ بار بار بہہ چکا ہے اور پھر ایک قدیم مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کی برکت سے آج تک قائم ہے۔

یہیں تو ایک بوڑھی عورت کو سونے کا 14 کلو وزنی وہ ہار ملا تھا جو انسان کی گردن میں ڈال دیا جائے تو انسان دُہرا ہو جائے۔ میرا تو خیال ہے ہاتھی کی پیشانی پر ڈالا جاتا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آثارِ قدیمہ والے لے گئے تھے۔ اب خدا جانے وہ کس کے گلے کا ہار ہے۔

میں پٹن کے باشندوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ قصبے کے تھانے میں علی اکبر صاحب مل گئے جو وہاں محرر تھے اور اپنی بارہ برس کی ملازمت میں انہوں نے بیسیوں مقدمے درج کیے ہوں گے۔ ان سے کھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے ان سے کہیں یہ پوچھ لیا کہ اس علاقے کے لوگ کیسے ہیں؟ کہنے لگے کہ نیک ہیں، نمازی اور پرہیزگار ہیں مگر جھوٹ بولتے ہیں اور بیان لکھواتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

یہاں مجھ سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی ایک بڑی بھول ہوئی۔ میں نے دریائے سندھ پر اپنا دستاویزی پروگرام "شیر دریا" نشر کرتے ہوئے علی اکبر صاحب کی باتیں جوں کی توں نشر کر دیں۔ غضب ہو گیا۔ علاقے کے باشندوں نے جوں ہی پروگرام سنا وہ جلوس بنا کر تھانے پہنچ گئے

اور غریب محرر کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔ ان کا غیظ و غضب دیکھ کر حکام نے علی اکبر صاحب کو معطل کر دیا۔

مجھے خبر ملی تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو غضب ہو گیا۔ سادہ لوح لوگ ہر طرح کی باتیں کہہ جاتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایک تجربہ کار براڈ کاسٹر ہوتے ہوئے ان کی باتوں پر دھیان نہ دوں اور یہ بھی نہ دیکھوں کہ سادگی میں کہی ہوئی ان کی باتیں نشر ہونے سے کہیں انہیں نقصان نہ پہنچے۔

یہاں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ اپنی حماقت سے یہ سبق سیکھنے میں اتنا عرصہ لگا کہ دریا کے ڈیلٹا کے علاقے میں ایک بار پھر مجھ سے یہی غلطی سرزد ہونے والی ہے۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

پٹن سے آگے نالہ ڈبیر ہے۔ یہ ایک پہاڑی نالہ ہے جو اونچائی سے بہتا ہوا آتا ہے اور چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ جھاگ ہوا جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر میں نے کہا تھا کہ آج میں نے دودھ کی نہر دیکھی ہے۔ اب شہد کی نہر دیکھنا باقی ہے۔

اور اگر نیکی کا دوسرا نام شہد ہے تو اگلے پڑاؤ میں وہ بھی دیکھ لی۔

یہ شہر بشام تھا۔ اس کا تلفظ بی۔ شام سمجھ لیجیے۔ جہاں میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ شہر میں برقعہ پوش، پردہ دار خواتین کا اتنا بڑا مجمع تھا۔ اس علاقے میں جہاں عورت کا سایہ بھی نظر نہیں آتا، یہ ڈیڑھ دو سو خواتین کہاں سے اور کیوں آگئیں۔ تب پتا چلا کہ وہ سب بیمار تھیں اور کوہستان کے اسی اچھے خاصے مہذب اور آباد علاقے میں عورتوں کے علاج کے لیے ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے لوگوں نے عطیات جمع کر کے بشام میں صرف عورتوں کے لیے ایک مسیحی شفاخانہ قائم کر دیا ہے۔ خواتین کے علاج کے لیے لاہور، پشاور، کوئٹہ یا کراچی سے نہیں بلکہ ناروے سے ایک خاتون یہاں آئی ہیں۔ علاقے کی عورتوں نے طے کر رکھا ہے کہ انہیں مر جانا منظور ہے مگر مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا منظور نہیں۔ وہ سب نارویجین خاتون کو نبض دکھاتی ہیں۔ اپنا معائنہ کراتی ہیں اور دوا لیتی ہیں۔ ان کا نام لائیلہ جوزف ہے۔ سند یافتہ نرس ہیں، اردو سیکھ گئی ہیں۔ مقامی بولی سمجھنے کے لیے ایک پاکستانی لڑکی کو ساتھ رکھتی ہیں۔ مجھ سے ملیں تو بڑے اخلاق سے، دیر تک اپنے کام کے بارے میں بتاتی رہیں۔ کوئی شکایت نہیں کی اور ان کا کوئی مطالبہ بھی نہیں تھا۔ اسی کو عرف عام میں نیکی کہتے ہیں۔ ایسے ہی نیک بندوں

کا پڑاؤ شہد کی نہروں کے کنارے پر ہوگا۔

اب ہماری جیپ نے دریائے سندھ کو آخری بار پار کیا۔ راہ میں درخت آنے لگے۔ سبزہ آنے لگا۔ کھیتیاں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ تھاکوٹ آ گیا۔ ہنستا بستا آباد قصبہ۔ بڑا بازار، بڑی دکانیں، اس سے بڑے چائے خانے۔

حیرت ہے جن علاقوں میں بادل پہنچتے ہیں وہاں نئی تہذیب کی جھڑی بھی لگی ہے۔ مجھے تبت کی سرحد سے تھاکوٹ تک ہر شخص اردو بولتا ہوا ملا لیکن یہاں تھاکوٹ میں ایک چائے خانے کے بیرے نے خود کو "نیگل مین" بتا کر مجھے حیران کر دیا اور ایک دکاندار کی زبان سے یہ سن کر دنگ رہ گیا کہ "یہاں پر زندگی اجیرن ہے۔" ابھی تو ایک تاریخی جملہ سننا باقی تھا۔

جیپ اور نیچے اتری تو تیلا چھنگ کا علاقہ آ گیا۔ گاؤں کے اسکولوں میں چھٹی ہوئی تھی۔ ملیشیا کی وردی، پیتو کی ٹوپی اور کینوس کے جوتے پہنے سیکڑوں بچے خوش خوش گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ گا رہے تھے۔ ان کا گانا انسان کی تخلیق سے شروع ہوا، بیچ میں قصہ یوسف و زلیخا آ گیا اور اللہ ہو کے نعرۂ مستانہ پر ختم ہوا۔ میں بزرگ کے قریب گیا۔ ادب سے انہیں سلام کیا اور پوچھا "بابا، آپ کی عمر کتنی ہے؟" کہنے لگے "مجھے چھوڑو اور زمین کی فکر کرو۔ وہ بہت تیزی سے بوڑھی ہو رہی ہے۔"

اب اس بوڑھی زمین کی شکن آلود پیشانی پر ٹکا ہوا ایک قطرہ دیکھنے کے لیے میں تربیلا ڈیم پہنچا۔

میں نے سن ساٹھ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں یہ ڈیم بنتے دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے بننے والی بہت بڑی جھیل کی وجہ سے اجڑ جانے والوں کو نئے ٹھکانے دیئے جانے کے بڑے بڑے وعدے سنے تھے۔ 25 سال بعد میں وہاں گیا تو پتا چلا کہ تربیلا کی جھیل کی تہ میں مٹی جمع ہو رہی ہے اور پانی کے ذخیرے کی گنجائش گھٹتی جا رہی ہے۔ پھر میں نے بے گھر ہونے والوں کو دیکھا جن سے کیے گئے وعدے بھلا دیے گئے تھے اور جن کے احتجاج اور مطالبوں کی طرف سے کان بند کر لیے گئے تھے۔

اب ہماری راہ میں وہ مقام آیا جسے تاریخ نے اور تاریخ دانوں نے بھلا دیا ہے۔ اس کا نام ہنڈ ہے۔ ہند کو جانے والے سارے لشکر یہیں سے دریا پار کیا کرتے تھے۔ دریا کے جن

کناروں کو بہتے ہوئے پانی نے کاٹا ہے، ان میں قدیم بستیاں تہ بہ تہ اوپر نیچے چنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی کے قریب چھوٹا سا قصبہ لہور ہے جہاں سنسکرت کا سب سے بڑا عالم پانینی پیدا ہوا تھا۔ لڑکوں نے اپنے کالج کے ہال کا نام اسی کے نام پر پانینی ہال رکھ دیا تھا۔

میرا اگلا پڑاؤ بھی اتنا ہی تاریخی تھا۔ دریائے سندھ کے کنارے اس مقام کا نام باغ نیلاب تھا۔ شیر شاہ سوری کی عظیم سڑک یہیں سے شروع ہو کر بنگالہ تک جاتی تھی۔

میں وہاں گیا تو میر کے یہ شعر ایک بار پھر یاد آئے۔

جہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں — وہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں
سنا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد — مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں

کبھی افغانستان کی طرف سے آنے والے اولیاء اللہ دریا پار کر کے یہاں پڑاؤ ڈالتے تھے اور یہاں کے سحر انگیز ماحول میں جذب ہو کر اسی کو اپنا ٹھکانہ بنا لیتے تھے۔ ان سب کی قبریں یہاں موجود ہیں۔ پرانی آبادی کے نشان ہیں، ماضی کی عظمتیں نظر تو نہیں آتیں مگر محسوس ہوتی ہیں۔ دریا یہاں آ کر بالکل چپ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ وہ اتنا تنگ ہے کہ کسی بہادر کے گھوڑے نے ایک ہی جست میں اسے پار کر لیا تھا۔ آج وہاں جو گاؤں ہے وہ اتنا صاف ستھرا، آراستہ اور سلیقے سے بنا ہوا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کوئی اور آ کر اسے بنا گیا ہے۔ بس یہ ہے کہ جو راہ اُدھر کو جاتی ہے وہاں محمد خاں ڈاکو کا علاقہ لگتا ہے۔ بزرگوں کی فیوض و برکات اس لٹیرے کو بھسم نہیں کر سکیں۔ خدا جانے ان بیس برسوں میں وہ رہا یا غارت ہوا یا اب وہاں اس کے جانشینوں کا راج ہے۔

اب مجھے داؤد خیل، کالا باغ اور کمر مشانی جانا تھا۔ اٹک سے میں اس ریل کار میں بیٹھا جو ماڑی انڈس تک جاتی ہے۔ وہاں سے سوزوکی وین میں بیٹھا۔ رات تاریک ہونے لگی تھی۔ وین کے ڈرائیور نے اعلان کیا کہ گاڑی اس سے آگے نہیں جائے گی۔ سب لوگ کسی دوسری سواری کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک ویگن آ کر رکی۔ ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور تمام مسافروں سے کہا: بیٹھ جائیے، یہ اس کی سراسر غلط بیانی تھی۔ ویگن کے اندر بیٹھنے کی نہیں، صرف کھڑے رہنے کی سہولت تھی کیونکہ یہ مویشیوں کو لانے لے جانے والی ویگن تھی۔ ان صاحب نے ہمیں وہاں اتارا جہاں سے کمر مشانی کی بس ملتی ہے۔ وہ ملی اور اس کے ڈرائیور نے ایک تاریک بستی میں پہنچ کر اعلان کیا کہ یہی کمر مشانی ہے۔ راہ میں ایک نوجوان نے میری ذمہ داری سنبھال لی۔ وہ تاریکی میں میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گیا جہاں پہنچ کر اس نے اعلان کیا کہ "ذرا سوچو،

میرے ساتھ کون صاحب آئے ہیں؟"

بس اس کے بعد ایک گھڑی کے نہیں، دلوں کے دروازے کھل گئے۔ خاطر مدارات کے بعد مجھے آرام سے سلا دیا گیا۔ اگلی صبح قصبے کی سیر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ میں اپنی ولایتی قمیض اور پتلون پہننے لگا۔ سب ایک ساتھ بولے کہ باہر لوگ اس لباس پر اعتراض کریں گے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کرتہ شلوار پہن لیں۔ گھر کے سارے نوجوان اپنے دھلے دھلائے جوڑے لے کر آ گئے۔ اس دوران زمانے بھر کے موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ مثلاً یہ کہ ٹیلی ویژن کے پردے پر کوئی مرد آ جائے تو عورتیں کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔

باتوں میں ایک عجیب سا جادو ہوتا ہے۔ ہم سب باتیں کرتے کرتے باہر نکل گئے۔ میرے تن پر لندن کی قمیض، ولایتی پتلون اور انگلستانی جوتے تھے مگر کسی کو خیال نہ آیا کہ شہر والے مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ وہ کیوں اٹھاتے۔ ان کی دکانوں میں ولایت کا مال سجا تھا۔ میں لندن سے ملنے والی شیشیاں، بوتلیں اور ڈبے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ قصبہ اسمگلروں کے راستے میں پڑتا ہے۔ کسی نے میرے لباس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

کرشتانی کے میرے میزبانوں پر اس وقت بجلی گری جب میں نے اعلان کیا کہ یہاں لڑکیوں کے اسکول کی استانیاں مجھے خط لکھتی ہیں، میں ان کے اسکول جا کر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چلنے والے اچھے خاصے جلوس نے نفی میں گردنیں ہلا دیں "مشکل ہے، نہیں ہو سکتا۔ ناممکن۔"

اندر اسکول لگا ہوا تھا۔ سیکڑوں لڑکیوں کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ اس کے صدر دروازے کے برابر میں ایک بیٹھک سی بنی ہوئی تھی جس میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ میں نے خواتین کا نام لے کر کہا کہ انہیں میرے آنے کی اطلاع کر دیجیے۔

بزرگ ذرا ہی دیر بعد واپس آئے اور بولے کہ چلیے میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔ میرے جلوس کے شرکا ٹھٹک کر رہ گئے۔ انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجرم کو پھانسی گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔

اندر ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے نہ مجھے دیکھا نہ میری سلیمانی ٹوپی کو۔ میڈم نے اور دوسری استانیوں نے گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اتنی دیر میں لڑکیوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کے اسکول میں کون آیا ہے۔ آج میں تصور کر سکتا

ہوں کہ کرمشانی کی پختہ عمر کی کم سے کم پچیس تیس خواتین کی کاپیوں میں میرے آٹوگراف موجود ہوں گے جو شاید وہ اپنے بچوں کو دکھاتی ہوں گی۔

میں اسکول سے باہر آیا۔ میرا جلوس ذرا سا دھے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب میرا حلیہ کیسا ہوگا؟

اب مجھے کالا باغ جانا تھا۔ میں نے کرمشانی والوں سے اجازت مانگی۔ انہوں نے جھٹ دے دی۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس سے پہلے کہ علاقے میں کوئی انقلاب آئے، اس پاکستانی فرنگی کو کالا باغ کا راستہ دکھا دو۔

راہ میں افغان پناہ گزینوں کا کیمپ دیکھتا ہوا اور پاکستان میں افغانستان کا لطف اٹھاتا ہوا میں کالا باغ پہنچا۔ جس کسی نے اس علاقے کے نام میں لفظ کالا لگایا تھا، اسے علاقے کے مقدر کا علم ہوگا۔

بس اتنا بتانا کافی ہے کہ سنہ 1947ء میں آزاد ہونے والے علاقے میں سنہ 1990ء میں آزادی آزادی کے نعرے میں نے اپنے کانوں سے سنے۔ جاگیردارانہ نظام یہاں پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ کچھ تو لوگوں سے بیگار لی جاتی تھی۔ کچھ کی املاک ضبط کی جارہی تھیں اور کچھ ایسے غائب کیے گئے تھے کہ اب نہ کہیں ان کا نام تھا، نہ نشان۔

اگر کوئی تھکے ہارے لوگوں کا دل دہلا رہا تھا تو وہ تھیں چائے خانوں میں وی سی آر پر چلنے والی ہندوستانی فلمیں۔ اُن میں بھی جو منظر میں نے دیکھا، وہ یہ تھا کہ ایک لڑکی کی آبرو پر حملہ کیا جارہا تھا اور حملہ کرنے والوں میں پولیس والے بھی شامل تھے۔

آج سوچتا ہوں کہ جو منظر جگہ جگہ حقیقت کے روپ میں نظر آ رہا ہے، اسی منظر کے لیے ہندوستانی فلم دیکھنے کی کیا مار پڑی تھی۔

اندھیرے سے اچانک روشنی میں نکلیں تو آنکھوں پر کیا گزرتی ہے، یہ دیکھنا ہو تو کالا باغ سے چل کر اچانک داؤد خیل میں نکلیں۔

نہ جانے کب اور کس کے دل میں نیکی آئی اور اس نے ضلع میانوالی کے اس دور دراز علاقے میں بڑے بڑے کارخانے لگوا دیے۔ سیمنٹ اور کیمیاوی کھاد کی دو بڑی فیکٹریاں اور ان سے منسلک دوسرے کاروبار قائم ہوئے تو یہ علاقہ جی اٹھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی نظر آئی۔ سرسبز علاقے میں نئی

ہوئی بڑی بڑی کالونیاں، عمدہ مکان اور سڑکیں، ویسی ہی دکانیں اور ویسی ہی چہل پہل۔ اوپر سے سرائیکی اور ہندکو جیسی عوامی بولیوں کی روایت کی پاسداری جس کے زیر اثر یہاں کے لوگ مہمان نواز اور سریلے۔ یوں بھی جس بستی کا نام حضرت داؤدؑ جیسے نبی کے نام سے وابستہ ہو، وہاں کے لوگ سُر یلے نہیں ہوں گے تو کہاں کے ہوں گے۔

کہہ نہیں سکتا کہ آج اس شہر اور علاقے پر کیا گزر رہی ہے۔ اگر دوسرے مقامات کا حال دیکھا جائے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ داؤدخیل کی بہتی گنگا میں کتنے ہی لوگ ہاتھ دھو رہے ہوں گے۔

اب داؤدخیل میرے پیچھے تھا اور میانوالی میرے آگے۔ اس شہر کو دیکھنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا کیونکہ علاقے کے لوک گیتوں کا میرے پاس بڑا ذخیرہ تھا اور ان تمام گیتوں کے گلوکار یہیں آباد تھے۔

جن دنوں میں میانوالی پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک قتل ہو چکا تھا۔ لوگوں نے کسی پرانے قتل کا حساب چکانے کے لیے اس شخص کو دور سے گولی ماری لیکن قریب جا کر دیکھا تو وہ کوئی اور تھا۔ قاتل "او یار۔ ویری سوری۔" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

میں میانوالی کے ڈگری کالج پہنچا تو لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان سے باتیں کر کے مجھے جتنی خوشی ہوئی اتنا ہی دکھ بھی ہوا۔ وہ سب پڑھ لکھ گئے تھے لیکن ان کی سرزمین بدستور اَن پڑھ تھی۔ ان کی بات سن کر دل بیٹھ گیا۔ "سر! یہاں قتل بہت ہوتے ہیں۔ انہیں رکوائیے۔" اور اس وقت تو دل دھڑکنا بھول گیا جب میں نے پورے مجمع سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے، تعلیم مکمل کر کے آپ کو روزگار مل جائے؟ پچاس ساٹھ آوازیں آئیں "نہیں۔"

میانوالی میں فولاد کا کارخانہ لگنا تھا، نہیں لگا۔ کالاباغ ڈیم بننا تھا، نہیں بنا۔ جو کچھ بھی بنا وہ جاگیرداروں کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے بنا۔

مجھے تو یوں لگا کہ میانوالی ایک ایسی عورت ہے جو بغیر میاں والی ہے۔

راستے میں شہر کندیاں پڑا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ پھل پھول رہا تھا۔ اس کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں جو آ کر کندیاں میں بس رہے ہیں؟ تب پتہ چلا کہ میانوالی کے علاقے میں آئے روز کے قتل اور اس کے انتقام سے تنگ آ کر لوگ کندیاں کو آباد کر رہے ہیں۔ یہ امن کا گہوارہ ہے۔ خدا جانے اس کے سر پر کس کا سایہ ہے۔

مگر سر پر جیسا سایہ ہم نے اگلی بستی میں دیکھا، اسے بھولنا مشکل ہے۔ بلوٹ شریف

بہت پرانی بستی ہے جس میں قدیم خاندان آباد ہیں۔ وہاں سروں پر آنے والے جن اتارے جاتے ہیں۔ ہمیں وہ کشادہ عمارت دکھائی گئی جس میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں ڈھول کی تھاپ پر جھوم رہی تھیں یا کہہ لیجیے کہ کھیل رہی تھیں۔ ان کے سر پر کیا تھا، ہمیں نہیں معلوم مگر ان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

وہاں بزرگوں کی پرانی نسل تو رخصت ہوئی۔ اب کھیلنے والوں کی نگہداشت مخدوم زادہ حاجی جعفر شاہ کرتے ہیں جو پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم پا چکے ہیں۔ انہیں بھی جنات کے بارے میں شک تھا۔ آخر ایک ان پڑھ، جاہل مطلق دیہاتن نے انہیں انگریزی میں ڈانٹ دیا اور دو تین نشانیاں بتائیں تو وہ بھی ایمان لے آئے۔

شہر ڈیرہ اسماعیل خاں اب جہاں ہے، پہلے نہیں تھا۔ یہ شہر ذرا فاصلے پر تھا مگر اسے دریا بہالے گیا، شہر والے اپنی بستی اٹھا کر موجودہ جگہ لے آئے مگر کیا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ شہر یہیں رہے گا۔

پہلے اسے پرانے سیلاب نے روندا۔ اب نیا سیلاب اس کی بنیادوں میں اتر رہا ہے لیکن ایک اس سے بڑا سیلاب بھی ہے۔ جس روز میں وہاں پہنچا تھا اور شہر کے اکابرین سے باتیں کر رہا تھا تو کسی نے ایک جملہ کہا تھا جو اس وقت میں نے سنا اَن سنا کر دیا۔ مقامی یونیورسٹی کے ایک استاد کہہ رہے تھے کہ علاقے کی ثقافت پر بیرونی اثرات غالب نہیں آئیں گے کیونکہ ان کے بقول "یہاں پر بہت ہی زیادہ اسلامی ذہن ہے۔"

مذہب کے نام پر ڈیرہ اسماعیل خاں میں جیسی خونریزی ہوئی ہے، اس سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ مذہب کو زمین پر اتارنے والا ہی ہو سکتا ہے۔ کسی نے اس علاقے میں ایک عظیم یونیورسٹی بنا کر علم کی چھوٹی سی شمع نہیں، بڑا سا الاؤ روشن کیا لیکن علم بھی ذہن کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

14 میل چوڑے پاٹ والے دریائے سندھ کے کنارے ڈیرہ اسماعیل خاں نام کا یہ شہر باقی دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ پھر کسی کے دل میں نیکی آئی اور اس نے دریا پر پُل باندھ دیا۔ کشتی کے ذریعے یہ سفر ایک دن میں طے ہوتا تھا۔ اب نصف گھنٹہ بھی نہیں لگتا۔

مجھے دریا کے دائیں کنارے پر چل کر ڈیرہ غازی خان پہنچنا تھا مگر مجبوراً مجھے بھی یہ پل پار کرنا پڑا کیونکہ اس ڈیرے سے اس ڈیرے تک میرے نقشے پر سیدھی سڑک نظر آتی تھی، اسے پانی کے ریلے ریزہ ریزہ کر چکے تھے۔ احباب نے مشورہ دیا کہ دریا پار کر کے چلے جایئے اور وہاں

سے ٹرین یا بس لے کر ڈیرہ غازی خاں چلے جائیے۔

اس طرح میں اس پل پر روانہ ہوا جس کا ایک سرا صوبہ سرحد اور دوسرا صوبہ پنجاب میں تھا۔ وہ رات میں نے بھکر میں گزاری۔ چھوٹی بستیوں میں ایک نعمت افراط سے ملتی ہے: محبت۔ بھکر میں مجھے جاننے والے کم نہ تھے جنہوں نے ایسی دلجوئی کی کہ رات کا گزرنا محسوس تک نہ ہوا۔

وہ اچھے دن تھے۔ صبح کی ٹرین مقررہ وقت پر آ گئی۔ میں سوار ہوا تو ٹرین کے عملے کو میری موجودگی کی خبر ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت لذیذ ناشتہ اور خوب گرم چائے ملی۔ ریل گاڑی چلتی گئی۔ میں دونوں طرف کی بستیوں کا مشاہدہ کرتا گیا۔ خود اپنے تاثرات ریکارڈ کیے۔ اس وقت پہلی بار خیال آیا کہ کیوں نہ ریل گاڑیوں کے نظام پر کوئی پروگرام ترتیب دوں۔ پانچ سال بعد یہی گاڑیاں تھیں، یہی میں تھا اور "ریل کہانی" کے نام سے نئی تحقیق جاری تھی۔

میں ڈیرہ غازی خاں پہنچ تو گیا مگر کسی بھٹکے ہوئے اجنبی کی طرح۔ میں اس شہر میں کسی سے واقف نہ تھا۔ میری کتاب میں کسی کا نام پتہ یا ٹیلی فون نمبر نہیں تھا۔ یہاں سامعین تو ہزاروں ہوں گے لیکن مجھے کسی کا نام یاد نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ رات کہاں گزاروں گا۔

اسٹیشن پر اترتے ہی جو پہلی معقول صورت نظر آئی وہ گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو سارا ماحول جگمگا اٹھا۔ وہ بلند آواز سے بولے "عابدی صاحب، ڈیرہ غازی خاں آنا مبارک ہو۔ بتائیے آپ کی کیا خدمت کی جائے۔" میں نے کہا کہ مجھے شہر کے کالج تک پہنچا دیجیے۔ فوراً ہی تانگہ منگا لیا گیا۔ ذرا دیر بعد میں شہر کے کالج میں داخل ہوا اور راہداری میں ملنے والے پہلے استاد سے اپنا تعارف کرانے کی دیر تھی کہ پورے کالج میں میرے آنے کی خبر پھیل گئی اور پھر جو محفل جمی وہ صحیح معنوں میں استادوں کی محفل تھی۔

ذرا دیر پہلے مجھے فکر تھی کہ رات کہاں قیام ہوگا۔ اب یہ فکر تھی کہ کسے انکار کروں اور کس طرح معذرت کروں۔ آخر قرعہ پروفیسر شریف اشرف صاحب کے نام نکلا جو خالص میرے ڈھب کے آدمی تھے۔ علاقے کی تاریخ، روایت اور ثقافت میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے۔

میں ان کے گھر پہنچا تو برآمدے میں ایک عجیب چیز دیکھی۔ میں اپنی عمر میں کھٹیا، کھاٹ کھٹولا، پلنگڑی اور پلنگ دیکھ چکا تھا مگر یہ تو مہا پلنگ تھا جس پر چاہے تو پورا کنبہ سو سکتا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے خوشی سے جواب دیا "ہماچی۔" میں نے کہا "اتنی بڑی؟" کہنے لگے کہ یہ تو چھوٹی ہے، ہماچی کہلاتی ہے۔ اس سے بھی بڑا ہماچا ہوتا ہے جس پر

پورا محلہ بیٹھ سکتا ہے۔

اسے آپ ڈیرہ غازی خاں کے باشندوں کا کلب کہہ سکتے ہیں۔ جگہ جگہ ہماچے پڑے ہوئے تھے اور علاقے بھر کے لوگ اس پر بیٹھ کر دنیا زمانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ دانتوں کے معالج نظام فرید صاحب نے بتایا "میں تعلیم حاصل کرنے کی خاطر چودہ بیس سال کے لیے شہر سے باہر گیا اور جب لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ جن لوگوں کو میں جس ہماچے پر بیس سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا، بیس سال بعد وہ لوگ وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔" کہنے لگے "ہماچے نے ان لوگوں کو سست بنا دیا اور انہوں نے ترقی نہیں کی۔"

یہ غریب لوگ زندگی کے ایسے کٹھن دن دیکھ چکے ہیں جب ان کا اناج جاگیردار چھین کر لے جاتے تھے اور ایک اناج ہی کیا، وہ ان کی بہو بیٹیاں بھی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ ان کی عمریں برساتی نالوں کے کنارے اُگنے والا خودرو ساگ کھاتے کھاتے گزریں۔

غلام حیدر پتھر

میں نے ڈیرہ غازی خاں میں دو دن گزارے۔ بے شمار لوگوں سے ملا اور باتیں کیں مگر ایک شخص تھا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہم غازی خاں اول کے مزار پر گئے۔ ان کے آبائی قبرستان کے باہر ایک بزرگ بڑے سے کڑھاؤ میں ڈیرہ کا مشہور حلوہ بھون رہے تھے۔ ان کا نام غلام حیدر تھا اور سارا شہر انہیں جانتا تھا۔ انہوں نے بڑے فخر سے اپنا پورا نام بتایا "غلام حیدر پتھر۔"

جن دنوں شہر کی ساری آبادی پاکستان کے نعرے لگاتی ہوئی سڑکوں پر نکل آتی تھی اور انگریزوں کے پٹھو حکمران ان پر لاٹھی چارج کیا کرتے تھے اس وقت غلام حیدر ہاتھوں میں چاند ستارے کا پرچم اٹھائے رکھتا تھا۔ وہ مار کھاتا جاتا تھا مگر پرچم کو جھکنے نہیں دیتا تھا۔ پھر جب پاکستان بنا تو شہر والوں نے غلام حیدر پتھر کو بھینچ بھینچ کر سینے سے لگایا جیسے پاکستان کی بنیاد کا پہلا پتھر اسی نے رکھا ہو۔

پھر کیا ہوا۔ وقت کی سواری اپنی گاڑی سرپٹ دوڑاتی ہوئی دور نکل گئی۔ غلام حیدر اس کی گرد میں تنہا بیٹھا ایک ایک کی صورت تکا کرتا۔ پھر کسی نے اس کی خبر نہ لی اور اس کی باقی عمر حلوہ بھونتے ہوئے گزر گئی۔ تنگ آ کر اس نے اپنا تخلص اپنے سینے پر دھر لیا۔

اب مجھے سڑک کے راستے راجن پور کی طرف جانا تھا۔ میں نے شہر والوں کو اپنا ارادہ

بتایا تو بعض ایک تو سہم گئے۔ کہنے لگے اس طرف ڈاکوؤں کا بسیرا ہے۔ اکثر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ میں نے کہنا چاہا کہ مجھے نہیں لوٹیں گے لیکن انہوں نے بالکل وہی بات کہی جو سہرام والوں نے کہی تھی۔ آگے ڈاکو ہیں۔ آپ جو اپنی مشین میں آوازیں بھرتے ہوئے آرہے ہیں۔ یہ لٹ گئیں تو آپ کی پچھلی ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔

آوازیں لٹ جانے کی بات میں نے پہلی بار سنی اور راجن پور دیکھنے کا جو موقع پہلی بار اور شاید آخری بار ملا تھا، وہ میں نے گنوا دیا۔

اور آج جب میں یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں، راجن پور کی سڑکوں اور گلیوں کو سیلاب نے روند ڈالا ہے اور جانیں بچا کر، بسے بسائے گھر چھوڑ کر بھاگنے والوں کے مکانوں میں چور اچکوں نے جھاڑو پھیر دی ہے۔ (اگست۔ سنہ 2010ء)

مجھے اپنی جان سے زیادہ اپنی ریکارڈنگ عزیز تھی جسے اٹھائے اٹھائے میں متبادل راستوں سے اس شہر میں جا پہنچا جس کا نام میں بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ وہاں سب سے اچھے بسکٹ بنتے ہیں اور سب سے بڑا بیراج ہے: سکھر!

سکھر سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہ بات اس کے حق میں نہیں جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسے اب نہ بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے اور نہ چھوٹے شہروں میں۔ اس روز بلا تفریق ہر ایک نے کہا کہ یہ شہر ترقی نہیں کر رہا ہے۔

میں دو دن تک سکھر کی گلیوں میں گھومتا پھرا اور یہ دو دن مفلسی کا نظارہ کرتے گزرے۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی کھڈیاں لگی تھیں جن پر کھڑے نوعمر لڑکے ہر قسم کا کپڑا بن رہے تھے۔ میں خوش تھا کہ اتنے بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہے مگر جب ان سے بات کی تو پتا چلا کہ دن دن بھر کی مشقت کے بعد انہیں آٹھ روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔

برِصغیر کی تقسیم کے وقت سرحد پار سے جو لاکھوں افراد اس علاقے میں آئے تھے، مقامی باشندوں نے ان کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے تھے مگر جس روز میں وہاں گیا، ان کے درمیان تعصب کی دیوار اٹھ چکی تھی۔ پرانے باشندوں کا وہی پرانا رنگ ڈھنگ تھا اور نئی نسل کی بچیاں گلیوں میں وہی گانا گا رہی تھیں جو کبھی دہلی، آگرہ، میرٹھ اور بریلی میں ان کی نانیوں اور دادیوں نے اپنے بچپن میں گایا ہوگا۔

ہرا سمندر، گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی
اتنا پانی......
اتنا پانی!

لاڑکانہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ کبھی سندھ کا پیرس تھا۔ پرانے باشندوں نے اسے سنوارا تھا اور سکھر بیراج کی تعمیر سے پہلے بھی اس علاقے میں نہریں موجود تھیں۔ ایک نہر تو شہر کے بیچوں بیچ گزرتی تھی جس کے دونوں کناروں پر باغ ہی باغ تھے۔ شہر کے ہندو باشندے چلے گئے تو اس کی رونق میں کمی آئی مگر پھر شہر کے فرزند ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کا دور آیا تو لاڑکانہ دوبارہ جی اٹھا۔

پھر یہ ہوا کہ بھٹو صاحب مر گئے۔ کچھ وہی حال ان کے شہر کا بھی ہوا۔ جس روز میں بس میں بیٹھ کر سکھر سے لاڑکانہ پہنچا، وہ اجڑ رہا تھا۔ مجھے جس شاندار ہوٹل میں قیام کرنا تھا، وہ ویران پڑا تھا۔ جس بات نے میرا حوصلہ بلند کیا وہ لاڑکانہ کے باشندے تھے۔ ان کا حسنِ اخلاق مجھے متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ان ہی لوگوں میں ہونہار صحافی احمد خاں کمال بھی مل گئے۔ مہاجر بن کر آئے تھے مگر اب بالکل سندھی بن گئے تھے۔ مجھے شہر اور شہر والوں کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ اب پرانے باشندوں اور نو واردوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔

کچھ عرصے بعد یہ ہوا کہ احمد کمال کسی پریس کانفرنس سے نکل کر اس کی خبر بھیجنے کے لیے تار گھر کی طرف جا رہے تھے کہ دن دہاڑے کچھ لوگوں نے اُن پر گولیاں برسائیں۔ اس بار اُن کے اور قاتلوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔

لاڑکانہ میں اس روز اچھی خاصی سردی تھی۔ شام کو جی گھبرایا تو میں بازار میں گھومنے چلا گیا۔ وہاں چکن کارن سوپ فروخت ہو رہا تھا جس سے اٹھتی ہوئی بھاپ بھلی لگی اور میں نے ڈٹ کر ایک پیالہ پیا۔ قریب ہی جاڑوں کے پھلوں کا تازہ عرق نکالا جا رہا تھا۔ میں نے وہ بھی پی لیا اور ابھی وہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ پھلوں کے ساتھ انفلوئنزا کے جراثیم بھی کھلے جا رہے ہیں۔ حلق میں چھوٹا سا تیر پیوست ہوتا صاف محسوس ہوا۔

اگلی صبح میں نئی منزل کی طرف چلا۔ راہ میں موہنجوداڑو کے آثار دیکھے تو یوں لگا کہ بالکل آج کی اینٹوں کی ادھوری دیواریں کھڑی ہیں۔ گلیوں میں ان ہی اینٹوں کا فرش تھا جس پر چلتے ہوئے میں نے کئی بار پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ہزاروں سال پرانا کوئی شریر لڑکا میرا تعاقب کر رہا تھا۔

جوں ہی میں مڑ کر دیکھتا، وہ سرخ اینٹوں کی کسی دیوار کی آڑ میں چھپ جاتا یا خشک پڑے ہوئے اس بڑے سے حوض میں اتر جاتا جس میں کبھی بیچوں کے بل سیڑھیاں اترتے اترتے عورتیں آہستہ سے پانی میں چلی جاتی ہوں گی تو سطح آب پر ان کے چمکیلے بال پھیل جاتے ہوں گے۔

ذرا آگے وہ مقام پڑا جسے سیتا روڈ کہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہیں وہ جگہ ہے جہاں شہنشاہ ہمایوں اور حمیدہ بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ کسی نے کوئی شادیانے کا مجسمہ نصب کر کے چھوٹی سی یادگار بنادی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

مگر کچھ آگے ایک بہت بڑی یادگار میری منتظر تھی۔ حضرت لعل شہباز قلندر کی آخری آرام گاہ جو آج بھی ایک خلقت کو آرام، سکون اور چین عطا کر رہی تھی اور جہاں مرادوں کے مقدر میں تکمیل کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

مگر میرے مقدر نے جاگنے میں ذرا دیر لگائی۔ یوں تو اس شام وہاں دنیا کے سب سے دراز قد جوان عالم چنا کی شادی تھی جس میں مجھے فوراً ہی شریک کر لیا گیا مگر مجھے یہ خیال ستائے جا رہا تھا کہ یہاں کوئی میرا میزبان نہیں۔ میں رات کہاں گزاروں گا۔ اس دوران مجھے حکومت کا مہمان خانہ مل گیا جس کے نگراں نے مجھے اتنی رعایت سے نوازا کہ گیسٹ ہاؤس کا خصوصی مہمانوں کا کمرہ میرے لیے کھول دیا گیا۔ البتہ خبردار کر دیا کہ اگر رات ہونے سے پہلے کوئی سرکاری مہمان آ گیا تو آپ کو کمرہ خالی کرنا ہوگا۔

ابھی میں نے آمادگی پوری طرح ظاہر بھی نہیں کی تھی کہ کوئی سرکاری افسر صاحب تشریف لے آئے اور مجھے کمرے سے جاتے ہوئے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی قصور کیا ہو۔

ادھر عالم چنا کی شادی کے کھانے کا وقت ہو گیا اور میں وہاں چلا گیا۔ وہاں میری ملاقات کراچی کے ایک چھوٹے سے اخبار کے اتنے ہی چھوٹے سے رپورٹر سے ہوگئی جو کوڑی جیسے چھوٹے سے قصبے سے خبریں بھیجنے کا فرض سرانجام دیتا تھا مگر صاحب! صحافی ہونے کے چمتکار کا راز مجھ پر اس شام کھلا۔

رپورٹر صاحب نے مجھ سے پہلی بات یہ پوچھی کہ رات کو آپ کہاں قیام کریں گے۔ میں نے سرکاری مہمان خانے سے بے دخلی کی کہانی سنائی تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ قریب ہی ایک سرکاری اہلکار ہاتھ باندھے صحافی کی خدمت میں کھڑا تھا۔ صحافی نے اسے قریب بلا کر کہا "عابدی صاحب بھی وہاں پہاڑی کی چوٹی پر ریسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ سارا انتظام صحیح

ہونا چاہیے۔"

اہلکار لپک کر کہیں چلا گیا۔ (اس وقت تک موبائل فون کا رواج نہیں تھا۔) ذرا دیر میں ایک کار ہمیں لینے آ گئی اور ہم دونوں کو نہایت دلکش پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں لے گئی جہاں سے سیہون شریف کا ایسا دلکش نظارہ پہلے تو شہنشاہ ہمایوں اور حمیدہ بیگم اور پھر ذوالفقار علی بھٹو نے کیا ہوگا۔ بھٹو صاحب کے بارے میں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کیونکہ ریسٹ ہاؤس میں مجھے سونے کے لیے جو بستر دیا گیا، اس پر بھٹو صاحب سو چکے تھے۔

ابھی میں کوٹری کے چھوٹے سے نامہ نگار کے اثر و رسوخ پر حیرت زدہ تھا کہ پولیس کی کچھ شاندار گاڑیاں آئیں جس میں مقامی حکام بیٹھے تھے۔ انہیں میرے آنے کی خبر ہوئی تو وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ آتے ہی بولے کہ "عابدی صاحب، آپ کو چاہیے تھا کہ ہمیں اپنے آنے کی خبر کرتے، یہاں سکیورٹی کے مسائل ہیں اور ہمیں آپ جیسے مہمانوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

میں دیر تک سوچتا رہا کہ کس کا اثر و رسوخ زیادہ ہے، میرا یا اس غریب کوٹری کے ضلعی نامہ نگار کا جس کی خدا جانے کراچی سے تنخواہ بھی آتی ہے یا اپنے اسی اثر و رسوخ کی کھاتا ہے۔ نیچے شہر میں رات بھر جشن کا سماں رہا۔ وہ وہاں ہر رات کا معمول تھا۔ میں نے سونے سے پہلے اپنے تکیے کو سونگھا۔ میرا خیال تھا اس میں بھٹو صاحب کی خوشبو ہوگی۔

صبح ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ انفلوئنزا کا جو عرق میں غٹاغٹ پی گیا تھا، وہ اب سر اٹھا رہا ہے۔ میں نے طے کیا کہ سویرے ہی حیدر آباد چلا جاؤں لیکن سرکاری اہلکاروں کا اصرار ہوا کہ درگاہ سے قریبی تعلق رکھنے والے عزت علی شاہ صاحب سے مل کر جاؤں۔ ان کے بزرگ بھی درگاہ سے وابستہ رہے تھے۔ بڑے پیار سے ملے اور مجھے بتاتے رہے کہ ملک کے حالات پر شہنشاہ حضور کیا محسوس کرتے تھے۔ شہباز قلندر کو مسلسل شہنشاہ حضور کہتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ان کا اُن سے اب تک رابطہ ہے۔

عزت علی شاہ بتا رہے تھے کہ سیہون آنے والا ہر شخص شہنشاہ حضور کی مرضی سے یہاں آتا ہے اور جب اُن کی مرضی ہوتی ہے تب جاتا ہے۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھتے اٹھتے دوپہر ہو گئی۔ میں پریشان تھا کہ حیدر آباد پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔

میری کار حیدر آباد کی سمت لوٹ رہی تھی کہ ایک جگہ وردی پوش رینجرز کا مجمع دیکھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ لوگ ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہے تھے جو آج صبح سے یہیں سڑک پر کھڑے آتی جاتی گاڑیوں کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔

کسی نے کہا "آپ تاخیر سے نکلے۔ بچ گئے۔"
میں نے کہا "میں بچا نہیں، مجھے بچایا گیا ہے۔"

جب میں حیدرآباد پہنچا تو جو حال میرے درجہ حرارت کا تھا، کچھ وہی حال شہر کا بھی تھا۔ کہیں کوئی دیوانہ گولی چلا رہا تھا، لاکھوں کی آبادی سہمی ہوئی تھی۔ میں شہریوں سے ملنے چلا۔ کچھ صحافیوں سے ملا۔ کچھ تاریخ دانوں سے، کچھ قدیم باشندوں سے اور کچھ نئی بستیاں بسانے والوں سے۔ سب نے یہی کہا کہ آپ پچاس سال پہلے آئے ہوتے تو ایک ستھرے اور سلیقہ مند شہر کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ جب یہاں قدم قدم پر باغ تھے، کوٹھیاں تھیں، حویلیاں تھیں، جب لوگ صاحب حیثیت تھے اور جب یہاں کے ہندو باشندوں نے شہر کو سنوار کر رکھا تھا۔

میں نے ایک جگہ دیکھا، کچھ مزدور ایک پرانی عمارت کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں سیسہ پلائی دیواریں، ویسی دیواریں تھیں اس عمارت کی جو کبھی بلا کی شاندار رہی ہوگی۔ مزدور ہانپ رہے تھے، پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے اور پرانی اینٹیں سرکنے سے بھی انکاری تھیں۔

میں نے کسی سے پوچھا کہ اب کیا بنے گا؟ جواب ملا "بننا کیا ہے، وہی مارکیٹ، وہی شاپنگ پلازہ اور وہی شاندار فلیٹ۔"

حیدرآباد میں تین چیزیں کمال کی بنتی ہیں۔ ربڑی، ٹین کے بہت بڑے بڑے ٹرنک اور شیشے کی نازک چوڑیاں۔ بخار کی آمد آمد تھی اور منہ کا ذائقہ ایسا ہو رہا تھا کہ جی ربڑی کی طرف ذرا سا بھی مائل نہ تھا۔ ٹین کے ٹرنک بنانے والوں سے ملا اور پوچھا کہ لوگ اتنے بڑے بڑے ٹرنک خرید کر کیا کرتے ہیں۔ ان میں تو پورا کنبہ سما سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان میں لوگ اپنا سارا ساز و سامان رکھتے ہیں اور خصوصاً بیٹیوں کا جہیز انہی میں جمع کرتے ہیں۔

اس تحریر کے وقت سندھ میں شدید سیلاب کی جو کیفیت میں ٹیلی وژن پر دیکھ رہا ہوں، اس میں دیکھا ہے کہ جان بچا کر سیلابی ریلے میں چلنے والے لوگ اپنے ساتھ وہی ٹین کے ٹرنک پانی پر تیراتے ہوئے لیے جا رہے ہیں۔

ٹرنک تیر رہے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ اب وہ مال و اسباب سے اور بیٹیوں کے جہیز سے خالی ہوں گے۔

حیدرآباد میں چوڑی بنانے والوں کی فیکٹریاں دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔ پتہ چلا کہ چوڑیاں تو شیشے کے بڑے کارخانے میں بنتی ہیں۔ کاریگروں کو سادہ اور بے رنگ چوڑیوں کی بڑی بڑی لڑیاں ملتی ہیں۔ یہ لوگ انہیں کاٹ کر ایک ایک چوڑی الگ کرتے ہیں اور پھر ٹانکا لگا کر خود ہی ان کی اصلاح میں ان کا منہ بند کرتے ہیں۔

میں ان کے چھوٹے چھوٹے کارخانے دیکھنے گیا۔ کاریگر شعلوں کے آگے بیٹھے چوڑیوں کے منہ بند کر رہے تھے۔ فضا میں آگ کی شدید تپش تھی۔ میں نے ایک کاریگر سے کہا کہ آپ جن کوٹھڑیوں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، انہیں ایئر کنڈیشن کیوں نہیں کرا لیتے۔ اس نے کہا کہ اول تو بیک وقت گرمی اور ٹھنڈک سے مزدور بیمار ہو جائیں گے۔ دوسرے فضا ٹھنڈی ہو گی تو چوڑیوں کا منہ مشکل سے بند ہو گا۔

یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا تو خیال ہے کہ کاریگروں کو یہ بات یوں سمجھا کر مالکوں نے مزدوروں کا منہ بند کر دیا ہے۔

میں شہر میں گھوم رہا تھا۔ بقرعید قریب تھی اور حیدرآباد کی ریشم گلی میں خواتین کا اور انہیں تاڑنے والے اوباشوں کا مجمع تھا۔ میں ایک بغلی گلی میں تھا کہ کہیں سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ دکانیں تیزی سے بند ہونے لگیں۔ لوگ دیکھتے دیکھتے منتشر ہو گئے۔ میں ایک نئی عمارت کے خالی پڑے ہوئے برآمدے میں چلا گیا۔ برآمدہ اتنا خالی بھی نہ تھا۔ ایک کونے میں فرش پر بیٹھا ایک چھوٹا سا لڑکا کسی پرانے کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"نانک۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"اسکول میں پڑھتا ہوں۔"

"اس وقت یہاں ریشم گلی میں کیا کر رہے ہو تم؟"

"ابھی ہم کام کر رہے ہیں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"میری امی غسل خانہ دھوتی ہیں، میں کچرا اٹھاتا ہوں۔"

"مگر یہاں تو گولی چل رہی ہے۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں۔ میں ہر وقت اپنی امی کے پاس رہتا ہوں۔"

میں نے سوچا: نئی نسل کے پاس اب بھی ایک پناہ گاہ بچی ہے۔

پرانی نسل کا حال بھی کچھ مختلف نہیں۔ حیدرآباد میں جب میرے بخار نے شدت اختیار کی تو میں نے کراچی میں اپنی والدہ والے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی دریائے سندھ کے ڈیلٹا کا علاقہ دیکھنا باقی تھا۔ اوپر پہاڑوں اور میدانوں میں دریا کے مختلف روپ دیکھ آیا تھا۔ جہاں آ کر دریا ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پھیلتا ہوا سمندر میں اُتر جاتا ہے، اُسے قریب سے دیکھنے کا مجھے یوں بھی اشتیاق تھا کہ دنیا کی ہر داستان کا انجام ہی کہانی کی گتھیاں کھولتا ہے۔ میں سندھ کے سارے الجھاوے دیکھ چکا تھا۔

میں نے ٹیکسی لی اور اس کی پچھلی سیٹ پر لیٹ کر ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو پیسے دے کر رخصت کیا اور ڈاکٹر کو فون کرتے کرتے یاد آیا کہ میرا کوٹ تو ٹیکسی ہی میں رہ گیا جس میں نہ صرف کافی رقم بلکہ میرا برطانوی پاسپورٹ بھی تھا۔ میں نے اپنا بخار اور اس کے اتارنے والے ڈاکٹر کو بھول بھال کر حیدرآباد فون کیا اور حکام سے مدد مانگی۔ وہ مل گئی۔ پولیس والوں نے نہ صرف وہ ٹیکسی ڈھونڈ نکالی بلکہ اس کی پچھلی نشست پر پڑا ہوا میرا کوٹ بھی حاصل کر لیا۔ آدھا بخار تو یوں اتر گیا، آدھا رنگ برنگی گولیوں نے اتارا۔

بوٹو بھائی

ہمارے ایک بوٹو بھائی تھے۔ اُن کے مکان پر ایم ایچ نقوی کے نام کی تختی لگی تھی لیکن ایک دنیا انہیں بوٹو صاحب کہتی تھی۔ اتنے مقبول عام تھے کہ انہیں پیار کے نام سے پکارنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں خواجہ ناظم الدین سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کی پہلی بیگم تک سیکڑوں لوگ شامل تھے۔ ناظم الدین یوں کہ انہیں طرح طرح کی مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا اور بوٹو بھائی فن مرغبانی کے استاد تھے۔ چنانچہ پرائم منسٹر ہاؤس میں ٹہلتے ہوئے چلے جاتے تھے اور باہر کھڑا ہوا حفاظتی عملہ انہیں سیلوٹ کرتا تھا۔ بیگم بھٹو سے ان کے مراسم کا سبب یہ تھا کہ بوٹو بھائی کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی جیپ لیے پورے سندھ میں مارے مارے پھرتے تھے اور جو کچھ مار کر لاتے تھے اس کا گوشت احباب میں تقسیم ہوا کرتا تھا۔

اپنی اس سندھ گردی کی وجہ سے وہ صوبے کے کونے کونے سے واقف تھے اور صوبے کا

بچہ بچہ ان کو جانتا تھا۔ بوٹو بھائی کو پورے سندھ میں بھٹو صاحب کہا جاتا تھا جس پر انہوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ دیہاتیوں میں بہت مقبول تھے۔ جہاں جاتے تھے کچہری لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور غریب سندھیوں سے اپنے خالص کانپوری لہجے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی باتوں کا انداز بھی سب سے جدا تھا۔ مثلاً کسی گاؤں کے اوطاق یا چائے خانے میں بیٹھے ہیں، ان کے گرد مقامی باشندوں کا مجمع ہے، انہیں اپنا کوئی کارنامہ سنا رہے ہیں۔ ''ارے صاحب، صبح سے شام تک میں نے اسّی مرغابیاں مار دیں۔'' پھر کہتے تھے ''کتنی؟'' سارا مجمع زیرِ لب کہتا تھا: اسّی۔ کہنے لگے ''محمد خاں جونیجو نے اس علاقے میں چالیس اسکول کھولے۔ کتنے؟''

مجمع آہستہ سے بولا ''چالیس۔''

کہیں بتا رہے تھے ''وڈیرہ اللہ بچایو نے بارہ ہرن پال رکھے ہیں۔ کتنے؟''

''بارہ۔''

اس روز بوٹو بھائی میری علالت کی خبر سن کر عیادت کو آئے۔ دیر تک میرے سفر کا احوال پوچھتے رہے۔ میں نے بتایا کہ صحت یاب ہوتے ہی مجھے زیریں سندھ کا دورہ کرنا ہے۔ دریا کا ڈیلٹا دیکھنا ہے اور اس کے سمندر میں گرنے کا منظر دیکھنا ہے۔ یہ سنتے ہی تن کر بیٹھ گئے ''ارے صاحب، یہ تو بہت آسان کام ہے۔ میں نے نئی جیپ خریدی ہے۔ آپ کو لے چلوں گا اور ڈیلٹا کا ایک ایک گاؤں دکھاؤں گا۔ کم سے کم دو سو بستیاں ہیں۔ کتنی؟''

اور اس سے پہلے کہ میں زیرِ لب دو سو کہتا، وہ اپنی نئی جیپ کی چابیاں بجاتے ہوئے اٹھے اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ''اگلے ہفتے تک ٹھیک ہو جایئے۔ فلاں گاؤں والے آپ کے پروگرام بہت شوق سے سنتے ہیں۔ آپ چلیں گے تو وہ لوگ جشن منائیں گے۔''

اس نوید نے ٹانک کا کام کیا اور ایک ہفتے میں میری توانائی لوٹ آئی۔ بوٹو بھائی اپنی جیپ دھلوا کر اور پٹرول بھروا کر آئے اور ہمارا زیریں سندھ کا سفر شروع ہو گیا۔

ہم سجاول پہنچے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے یہ ایک دریا کتنی ہی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس ڈیلٹا نے پورے علاقے کو ایک وسیع اور کشادہ میدان بنا دیا ہے جس میں کہیں گنا لگا ہے اور کہیں کیلا۔ سبزیاں اُگ رہی ہیں اور کھیتیاں لہلہا رہی ہیں مگر علاقے میں جس سے بھی بات ہوئی اس نے یہی شکایت کی کہ ہمارے حصے کے پانی پر پنجاب کا تسلط ہے۔ دریائے سندھ کا پانی اوپر ہی اوپر نکال لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں دریا کی آخری منزل ہے وہاں اس میں پانی بہنے کی بجائے

خاک اڑ رہی ہے۔

ان لوگوں کی باتوں میں بلا کی مایوسی تھی۔

سجاول اچھا خاصا آباد قصبہ تھا مگر آبادی کے نوجوانوں پر ویرانی کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف خالی خالی بیکار گھومتے ہوئے نوجوان نظر آئے۔ کام کے سوا وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس علاقے کی ایک عجیب روایت ہے۔ یہاں کے باشندے علاقے سے باہر جانے کے لیے تیار نہیں۔ ملازمت کے لیے انہیں کسی بڑے شہر کو جانا منظور نہیں۔ جاتے ہیں تو چند روز میں لوٹ آتے ہیں۔

نتیجہ بہت برا ہوا ہے۔ لوگ نشے کے عادی ہو گئے ہیں جس کے ساتھ ہی علاقے میں نئی وبا آ گئی ہے۔ جرائم زور پکڑ رہے ہیں۔

میرا اگلا پڑاؤ ٹھٹھہ تھا۔ مغلوں کے زمانے میں عظیم شہر تھا۔ دنیا بھر کے اہل علم یہاں جمع تھے اور دولت کی بھرمار تھی۔ پھر وہی ہوا جو بعض شہروں کے مقدر میں ہوتا ہے۔ سمندر دور چلا گیا۔ دریا نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کی بندرگاہ میں ریت بھر گئی۔ تجارت ختم ہونے لگی۔ حکمرانوں نے اپنا مال اسباب سمیٹا اور چلتے بنے۔

شہر پر ٹوٹنے والی وہ مصیبت ٹک ٹک کرنے والی گھڑی کی طرح آج تک چلی جا رہی ہے۔ بیروزگاری نے سر اٹھا رکھا ہے۔ شہری سہولتیں ناپید ہیں اور جمہوری نمائندے نے اپنے الیکشن پر جو دولت خرچ کی تھی، وہ چاہے بھی کہ واپس نہ آئے۔ وہ چلی آ رہی ہے۔

ہم آگے چلے۔ میں اس جگہ پہنچنے کے لیے بے چین تھا جہاں دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے۔ ہماری جیپ گھارو پہنچی جہاں ہم بڑی سڑک چھوڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر اتر گئے۔ دونوں جانب سیدھی اور سپاٹ زمین تھی۔ کسی نے کہا کہ ان میدانوں میں دریا پہلو بدلا کرتا تھا اس لیے سارا علاقہ اسکول کے بچے کی تختی جیسا ہو گیا ہے۔ ہماری جیپ چھوٹے سے قصبے میرپور ساکرو کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اچانک ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا: قصر ابوظبی۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ قصر تو محل کو کہتے ہیں۔ وہ بولے: جی ہاں۔ اس طرف ابوظبی کے شیخ کا محل ہے جو سارا سال خالی رہتا ہے اور کبھی کبھار ہی آباد ہوتا ہے۔

میں ذرا دیر کو دریا کا ڈیلٹا بھول گیا۔ میرے اصرار پر جیپ محل کی طرف مڑ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شفاف چمکتی فضا میں انڈے جیسی سفید عمارت کھڑی ہے۔ سارا علاقہ سرسبز و شاداب اور پوری

عمارت گنبدوں، محرابوں، دروں اور دریچوں سے آراستہ۔ میں بلا جھجک محل کے صدر دروازے پر جا پہنچا اور اس کے دربان سے اپنا تعارف کرایا۔

دربان اور اس کا مالی دنیا کے حالات جاننے کے لیے بی بی سی سنا کرتے تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ دونوں نے نہ صرف میری آؤ بھگت کی۔ محل کے بڑے کمرے کی سیر کرائی بلکہ محل کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی باتیں ریکارڈ کرائیں جن میں بلا کی سادگی اور غضب کا بھولپن تھا۔

صاحبو! یہاں اپنے قصور کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے ایسی خطا ہوئی کہ جب تک جیوں گا ندامت میری جان سے چمٹی رہے گی۔

ہوا یہ کہ میں نے واپس لندن آ کر اپنے پروگرام "شیر دریا" کے سلسلے میں دربان محمد شفیق اور مالی محمد صدیق کی مہمان نوازی، خاطر داری اور گفتگو کا احوال بی بی سی سے نشر کر دیا۔

محمد شفیق اور محمد صدیق کو اسی لمحے نوکری سے نکال کر اور بیروزگار کر کے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

دونوں نے مجھے خط لکھا اور اپنا دکھ بیان کیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ان کی بحالی کے لیے میں نے جتنی کوششیں کیں، ساری کی ساری خاک میں مل گئیں اور عربوں کی روایتی دریا دلی اور فراخدلی اور رحمدلی اس خاک میں اَٹ گئی۔

اب ہم کیٹی بندر کی طرف چلے۔ کسی زمانے میں علاقے کی اہم بندرگاہ تھی اور دریا کی ایک شاخ وہیں سمندر میں گرتی تھی۔ ہم میرپور ساکرو سے گزرے۔ اس کے بعد گھارو آیا اور پھر علاقے کا ایک ایسا لہلہاتا باغ آیا کہ جو باغ کا عالم تھا اسے دیکھ کر وہی دل کا حال ہوا اور وہ بھی دو مرتبہ۔ بوڑو بھائی مجھے خاص طور پر وہاں لائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ پیروزانی گھرانے کے کھیت اور باغ ہیں۔ حیرت ہو گئی۔ وہاں بھانت بھانت کے پھل لگے تھے اور طرح طرح کی سبزی اُگ رہی تھی۔ نالیوں میں تازہ پانی بہہ رہا تھا اور شام کی ہوا پھولوں سے لدی شاخوں کو چھو کر آئی تو نالیوں پر جھک کر منہ دھونے کا جیسا لطف اس شام آیا، کبھی نہ آیا تھا۔

پیروزانی گھرانے کے بزرگ محمد یوسف بتاتے رہے کہ کس طرح ان کے آباؤ اجداد نے ایک صدی پہلے آ کر اس علاقے کو آباد کیا اور کس طرح یہ لوگ تعلیم پا گئے ہیں جس سے زراعت میں بہت مدد ملی ہے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ اگلی بار جب آپ آئیں تو ولایت کے پھلوں اور سبزیوں کے بیج لیتے آئیں۔ ہم انہیں یہاں ٹھٹھہ کے علاقے میں اُگائیں گے۔ میں نے اس

یقین سے آمادگی ظاہر کی جیسے بس اگلے ہی برس آنا ہوگا۔

میں اس علاقے میں جتنے لوگوں اور محنت کشوں سے ملا زیادہ تر اپنے آپ کو کلمتی بلوچ کہتے تھے اور بتاتے تھے کہ وہ سو برس پہلے مغربی بلوچستان سے آئے تھے۔ میں نے نقشے میں دیکھا تو وہاں کیچ کا علاقہ نظر آیا جس کا شہزادہ پنوں یہیں ڈیلٹا کے اسی علاقے میں آیا تھا اور دریا میں نہیں، عشق میں غرق ہوا تھا۔

محمد یوسف صاحب بتا رہے تھے کہ کراچی کے قریب ہونے کے باوجود یہاں کا کسان بہت غریب ہے۔ بڑی منڈی نزدیک ہے مگر درمیان میں منافع کمانے والے دلال بہت ہیں۔ بس اس غریبی کا ایک فائدہ ہے کہ سب مل کر بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ سب شادی غمی میں شریک ہوتے ہیں اور علاقے میں بڑا چین ہے۔

محمد یوسف کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ مجھے اپنے علاقے میں ذرا سی زمین دلوا دیجیے۔ ٹھیک ہے، دلال میرا سارا منافع کھا جائیں گے مگر اس کے بدلے اگر باقی عمر چین سے کٹ گئی تو میں فائدے ہی میں رہوں گا۔

محمد یوسف اٹھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

بوٹو بھائی کی جیپ اب کھارو چھان کی طرف دوڑ رہی تھی۔ علاقے کے سرگرم سوشل ورکر عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ وہ بتا رہے تھے کہ اب آپ دریا کے میٹھے پانی کو سمندر کے کھارے پانی سے ٹکر لیتے دیکھیں گے۔ یہ منظر دیکھنے کا میرا اشتیاق اب زور مارنے لگا۔ میں ہزار میل دور لداخ میں اسی دریائے سندھ کا لڑکپن دیکھ کر آ رہا تھا، اب اس کا انجام دیکھوں گا تو خدا جانے میرے دل کا کیا حال ہوگا۔

ہماری جیپ پہلے ایک پکی سڑک پر اور پھر کچی سڑک پر دوڑی۔ اس کے بعد پہلے والی گاڑیوں کے پہیوں کے نشان رہ گئے۔ ہوا کی بو سے محسوس ہوا کہ سمندر قریب ہے مگر وہ سمندر کی نہیں، ان گہرے سیاہ اور پانی سے لدے ہوئے بادلوں کی بو تھی کہ پنجوں پر اونچے ہو کر ہاتھ اٹھائیں تو بیچ کی انگلی انہیں چھو لے۔

میں نے کہا کہ اگر یہ بادل برس گئے تو کیا ہوگا؟ عبدالعزیز بولے: خدا نہ کرے۔ ہماری گاڑی دلدل میں دھنس جائے گی اور اسے نکالنے کے لیے تو اونٹ منگوانا پڑیں گے۔

کسی نے ڈرتے ڈرتے اور میری مایوسی کا قیاس کرتے ہوئے پوچھا: کیا خیال ہے، واپس چلیں؟ جس طرح چینی تبت میں اُس جگہ کا نظارہ میری قسمت میں نہیں تھا جہاں یہ دریا چشمے کی شکل میں زمین سے پھوٹتا ہے، اسی طرح وہ مقام دیکھنا بھی میرے مقدر میں نہیں تھا جہاں دنیا کا ہر دریا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

ہم واپس لوٹے تو وہی بادل جو ہمارے سروں کو چھونا چاہتے تھے اونچے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ خدا جانے کب کا بدلہ لیا انہوں نے۔

رات ہو گئی تھی اور گاڑھو کے پیرزادہ گھرانے والے اصرار کر رہے تھے کہ یہیں ان کے مہمان خانے میں سو رہیے۔ صبح تڑکے چلے جایئے گا لیکن بوٹو بھائی مُصر تھے کہ ابھی لاڑیوں چلتے ہیں، سویرے وہیں سے شاہ بندر چلے جائیں گے۔

شاہ بندر کا نام میرے نقشے پر اور میری ڈائری میں جلی حروف میں لکھا تھا۔ شہزادہ اورنگزیب کی بنوائی ہوئی یہ بندرگاہ نہ دیکھی تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

گھپ اندھیرا تھا۔ غضب کا سناٹا تھا مگر دھان کے کھیتوں میں لاکھوں مینڈک شور مچا رہے تھے۔ بوٹو بھائی ہوتے تو پوچھتے: کتنے مینڈک؟

خدا خدا کرکے گوٹھ محمد یوسف چانڈیو آیا۔ اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور میں اس خیال سے شرمندہ تھا کہ اب وڈیرہ رئیس خان چانڈیو کی حویلی کے دروازے پیٹ پیٹ کر انہیں جگانا پڑے گا کہ ہم آپ کے مہمان آئے ہیں، ہمارے سونے کا بندوبست کر دیجیے۔ بوٹو بھائی میری پریشانی کو بھانپ گئے اور بولے کہ آپ دیکھتے جایئے۔

انہوں نے جیپ ایک عمارت کے سامنے روکی جو کسی ریلوے اسٹیشن کے درجہ اول کے مسافر خانے جیسی نظر آئی۔ اس کے کمرے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں ہلکے ہلکے بلب روشن تھے۔ اندر جا کر دیکھا۔ چارپائیاں آراستہ تھیں جن پر بستر لپٹے ہوئے رکھے تھے۔ وہ اس گاؤں کا اوطاق یعنی مہمان خانہ تھا۔ ہم نے چارپائیاں باہر کھینچیں اور ایک بہت بڑے درخت کے نیچے بستر لگا کر سو گئے۔

صبح کا ذب کا ہونا غضب تھا۔ ہمارے سروں پر سایہ کیے ہوئے گھنے درخت پر براجمان سیکڑوں ہزاروں پرندوں نے جو گانا شروع کیا تو ایک پورا سازینہ جھنجھنا اٹھا۔ سُروں کی ایسی جھڑی لگی کہ میں بوٹو بھائی کو آوازیں دیتا رہ گیا۔ میرا ٹیپ ریکارڈ ان کی جیپ کے اندر بند

تھا۔ جیپ کی چابی ان کی جیب میں تھی اور میرے دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں چاہتا تھا ان پرندوں کے نغمے ریکارڈ کرلوں جو میرے پروگرام میں بجیں گے تو دنیا حیران رہ جائے گی۔ مگر سورج نے نکلنے میں جلدی دکھائی۔ روشنی ہونے کی دیر تھی کہ پرندوں نے اڑان بھری اور سناٹا چھا گیا۔ رئیس خان جانڈیو کے ملازموں نے انہیں بوٹو صاحب کے آنے کی خبر سنائی۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے چھ سات سال کے بیٹے کے اور انڈے پراٹھے کے ناشتے کے ساتھ ہم سے ملنے آ گئے۔ ان کے کمسن بیٹے کو بھی سب وڈیرہ کہہ کر بلا رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ انسان بڑا ہو کر ہی وڈیرہ بنتا ہے۔

ان سے کھل مل کر باتیں ہوئیں۔ بتانے لگے کہ اس مہمان خانے میں نہ صرف صدر ایوب اور یحییٰ خان بلکہ پاکستان کے سارے صدر قیام کر چکے ہیں۔ ایک بار شاہ ایران بھی یہیں ٹھہرے تھے۔ یہ سب شکار کے لیے آیا کرتے تھے کیونکہ یہاں جھیلیں بہت ہیں اور پانی کے پرندوں کا بہترین شکار ہوتا ہے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر وہ سارے پرندے ابھی تک زندہ ہوتے اور صبح سویرے مل کر گاتے تو درختوں کے سائے تلے سونے والوں کے کان کئی روز بجتے رہتے۔

اب ہم اپنی آخری منزل یعنی شاہ بندر کی طرف چلے۔ مغلوں کے زمانے میں یہ بڑی بندرگاہ تھی جہاں جانے کے لیے راہ میں نہایت اچھی سڑک ملی۔ ویسی ہی جیسی جدید سڑکیں ہوتی ہیں۔ پھر عجب واقعہ ہوا۔ چلتے چلتے سڑک یکلخت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ریت ہی ریت تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ سڑک کو کیا ہوا؟ کسی نے بتایا کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو یہ سڑک بنوا رہے تھے۔ ایک روز صدر ضیاء الحق نے انہیں کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا۔ اسی روز سڑک بنانے والے مزدور بھی اپنا مال اسباب سمیٹ کر رخصت ہوئے۔

پہلے والی گاڑیوں کے پہیوں کے نشانوں پر چلتے ہوئے ہم سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ کسی نے کہا: یہ ہے شاہ بندر۔

میں حیرت سے منہ کھولے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہاں شاہ بندر نہیں تھا۔ کچھ اینٹوں کی ڈھیریاں تھیں۔ کچھ پرانی قبروں پر ہری جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ جس جگہ نقشے پر بڑا بڑا لکھا تھا: شاہ بندر، اب وہاں ہُو کا عالم تھا۔

کبھی یہاں عمارتیں رہی ہوں گی۔ اب ان کے کھنڈروں کو بھی سمندر کا کھارا پانی چاٹ

گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موہنجوداڑو کی طرح ساری آبادی اٹھ کر کسی جانب چلی گئی۔

کسی نے بتایا کہ تھوڑی دور جھاڑیوں کی آڑ میں دو ہزار کی آبادی کا گاؤں بچلو پران ہے۔ ہم وہاں پہنچے۔ گاؤں کے بچے کھیل رہے تھے اور گاؤں کے مرد چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں بچلو پران کے وڈیرے گل محمد آ گئے۔ میں نے جھٹ پوچھا: ''گل محمد صاحب، یہاں جو شاہ بندر ہوا کرتا تھا، وہ کہاں گیا؟''

جواب ملا ''سائیں یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ وہ شاہ بندر کہاں گیا۔ وہ جو میں نے دیکھا تھا، وہ پاکستان بننے کے بعد ختم ہو گیا۔ یہاں مالدار ہندو رہا کرتے تھے۔ وہ چلے گئے تو غریب مسلمان بھی چلے گئے۔ اب یہاں کھنڈر رہ گئے ہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے گل محمد سے پوچھا۔

''کیا ہوگا.... یہاں سمندر چڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میٹھا پانی ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔ اگر بند نہیں باندھا گیا تو ہمارا گاؤں ختم ہو جائے گا۔''

''بند کون باندھے گا؟''

''حکومت!''

میں نے ایک سرد آہ کھینچی اور گاؤں پر ایک نگاہ ڈالی۔

شاید آخری نگاہ۔

مجھے عبدالعزیز کی بات آج تک یاد ہے۔ میں نے کہا کہ تم بڑے سوشل ورکر ہو۔ بتاؤ ان کسانوں، مزدوروں اور مچھیروں کی خاطر کیا کیا جائے؟

وہ بولے ''میں کہتا ہوں کہ سب چیز بند کر دو۔ ہر چیز بند کر دو اور صرف تعلیم کھول دو۔ بچے بچے کو پڑھا دو۔ کوئی کسی کا حق نہیں چھینے گا۔ کوئی آپ کے دریا کا رخ نہیں موڑے گا۔ آپ کی زمینیں کوئی فوجی نہیں لے گا۔ کوئی وڈیرہ آپ کے خلاف سازش نہیں کرے گا۔ تمام مسئلوں کا یہی آخری حل ہے۔''

میرے دریا کے آخری پڑاؤ کی اتنی کامیاب سیر کرا کے بوٹو بھائی مجھے واپس کراچی لے آئے۔ مسافر نواز بہتیرے اور سفر وسیلۂ ظفر جیسے اقوال دل ہی دل میں دہراتے ہوئے میں نے بوٹو بھائی کے ہاتھ چومے اور دو روز بعد اپنے آوازوں سے بھرے درجنوں کیسٹ لے کر میں

خوشی خوشی لندن لوٹ آیا۔

راہ میں مجھے عبدالعزیز کی وہ بات یاد آتی رہی کہ سب چیز بند کر دو اور صرف تعلیم کھول دو۔ اسے یقین تھا کہ اس سے معاشرے کی ساری برائیاں دور ہو جائیں گی۔ عبدالعزیز نے معاشرے کی برائیاں بھی شمار کرائیں مگر وہ قتل و غارت گری کا ذکر بھول گئے۔

چند روز بعد میں نے اپنے کمپیوٹر پر پاکستان کے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی:

"ناظم آباد کے بلاک نمبر چار میں تکون پارک کے قریب نامعلوم افراد ایک شخص پر گولیاں برسانے اور اسے ہلاک کرنے کے بعد فرار ہو گئے۔ مرنے والے کا نام سید محبت حسین نقوی بتایا جاتا ہے۔"

وہ بڈو بھائی تھے۔ مارنے والوں نے بالکل قریب سے فائر کیا اور انہیں سات گولیاں لگیں۔

کتنی؟

--------O--------

maablib.org

آخری اسٹیشن

ریل گاڑی کی اور میری ولادت ایک ہی شہر میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھاپ سے چلنے والا پہلا ریلوے انجن سنہ 1851ء میں روڑکی میں چلا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ ریل گاڑی، اس کے چلنے کی آواز اور نہ صرف اس کے انجن بلکہ اس کے گارڈ کی سیٹی بھی میرے دل کو گدگداتی تھی۔

ہمارا پورا کنبہ ہر دوسرے تیسرے سال لد پھند کر ریل گاڑی کے ذریعے نجیب آباد اور وہاں سے بیل گاڑی پر سوار ہو کر جوگی پورہ جایا کرتا تھا جہاں ایک مقبول زیارت گاہ تھی۔ ریل کے سفر کے تصور ہی سے میری یہ کیفیت ہوا کرتی تھی کہ میں خود حیران ہوا کرتا تھا کہ میری بھوک اور میری نیند کو کیا ہوا۔ پھر اس سفر کا میرا پسندیدہ لمحہ اس وقت آتا تھا جب راہ میں ناشتے دان کھلتے تھے اور پوریوں کے ساتھ آلو کی بھجیا اور شامی کباب کھائے جاتے تھے۔ اب یاد آتا ہے کہ وہ بالکل ٹھنڈے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت مجھے وہ بھی منظور تھا۔

کتب خانوں، جی ٹی روڈ اور دریائے سندھ کے سفر کے بعد اور بی بی سی سے سبکدوش ہونے سے پہلے میں نے ٹھان رکھی تھی کہ ریل گاڑی پر جی لگا کر ایک پروگرام تیار کروں گا۔ آخر وہ لمحہ آگیا اور مجھے اس پروگرام کی منظوری مل گئی مگر صدی اپنے خاتمے کے قریب تھی۔ وقت بدل رہا تھا۔ بی بی سی کی انتظامیہ بدل رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بی بی سی کا مزاج تبدیل ہو رہا تھا۔ خبروں اور حالات حاضرہ پر زور بڑھتا جا رہا تھا۔ فیچر پروگرام ریڈیو کی آواز کی طرح فیڈ آؤٹ ہوتے جا رہے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں تو دریائے سندھ پر میں نے ساٹھ پروگرام ترتیب دیئے تھے اور جب تک میں نے خود نہیں کہا کہ بس، مجھے روکا نہیں گیا اور اب ریلوے کے موضوع پر میرے لیے صرف سولہ پروگراموں کی گنجائش نکالی گئی۔

اس وقت میں نے طے کیا کہ اپنا سفر اور اپنی تحقیق جی کھول کر کروں گا۔ پھر سولہ پروگرام بھی ترتیب دوں گا لیکن اس کے بعد جب ریل کو موضوع بنا کر اپنی کتاب "ریل کہانی" لکھوں گا تو جب تک موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہو جائے گا، آخری اسٹیشن نہیں آنے دوں گا۔

اب میں نے کوئٹہ سے ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے تک جانے کا قصد کیا۔ کتابیں پڑھ کر اور سامنے نقشے پھیلا کر اپنا ہوم ورک شروع کیا۔ پاکستان میں ہر جگہ میرا ہاتھ بٹانے والے موجود تھے۔ البتہ ہندوستان میں وہ بات نہ تھی۔ وہاں بی بی سی کے دلّی آفس میں ہمارے ساتھی قربان علی نے قریب ہی واقع ریلوے کی وزارت سے میرے لیے مفت سفر کا پاس حاصل کر کے مجھے بھیج دیا اور میں نے راہ میں اپنے پرانے سامعین کو اپنے ارادوں سے مطلع کر دیا۔

ریلوے کے معاملے میں کوئٹہ بے حد دلچسپ مقام ہے۔ ریل گاڑی کو پنجاب اور سندھ کے میدانوں سے کوئٹہ تک اور پھر آگے افغان سرحد پر چمن تک پہنچانے کے لیے انگریزوں نے انجینئرنگ کے شاہکار تراشے تھے۔ ان کا خواب تھا کہ روسیوں کی پیش قدمی روکیں گے اور ٹرین کو افغانستان تک پہنچا کر وسطی ایشیا اور پھر یورپ تک ریل گاڑیاں چلائیں گے۔ اس سے بھی بڑا شاہکار کوئٹہ سے فورٹ سنڈیمن تک ڈالی جانے والی ریلوے لائن تھی۔ اسے دیکھ کر انجینئر حضرات آج بھی دانتوں میں انگلیاں دیتے ہیں۔ اس کے آگے تو شملہ اور دارجلنگ کی ریلوے لائنیں بھی کچھ نہیں۔ ان دونوں پر روزانہ ہزاروں سیاح سفر کرتے ہیں۔ فورٹ سنڈیمن والی ٹرین چل رہی ہوتی، ایک خلقت انجینئروں کا وہ کارنامہ دیکھنے جاتی مگر پھر کیا ہوا؟

نہ سنا جائے گا مجھ سے یہ فسانہ ہرگز

وہ سارے انجینئرنگ سے زیادہ عزم اور ارادے کے کارنامے تھے۔ ویسا ہی عزم لے کر میں لندن سے کراچی اور وہاں سے کوئٹہ جا پہنچا۔ ہمارے دوست اسلم سنجرانی وہاں کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ انہوں نے ریلوے والوں کو چوکس کرنا چاہا تو میرا نام سُن کر ریلوے حکام نے خود ہی پذیرائی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ کوئٹہ میں ریلوے افسران کے لیے بنائے گئے انگریزوں کے بنگلے دیکھے تو حیرت ہوئی۔ کوئٹہ کے تاریخی زلزلے میں مرنے والے ریلوے ملازمین کے ناموں کی تختی دیکھی تو انسان کی جان کے احترام کی حقیقت مجھ پر کھلی۔ 31 مئی 1935ء کو ہلاک ہونے والے ایک سو چون ملازموں کے نام اس عقیدت سے کندہ کیے گئے تھے جیسے وہ کسی بڑی جنگ میں لڑتے لڑتے مارے گئے ہوں۔

کوئٹہ سے روانہ ہوا تو احساس ہوا کہ سندھ کے میدانوں سے بولان کے پہاڑوں کے راستے یہ ریلوے لائن کیسے کیسے دکھ اٹھا کے ڈالی گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کسی پہاڑی سرنگ سے گزرتی تھی۔ گاڑی نیچے اتر رہی تھی اور عام طور پر جو انجن گاڑیوں کو کھینچتا ہے، میری ٹرین کا انجن اسے روکے ہوئے تھا کہ وہ کہیں بے قابو نہ ہو جائے۔

راہ میں جگہ جگہ وہ لائنیں نظر آئیں جسے ریلوے کے مزدوروں کی زبان میں ''جہنم لائن'' کہا کرتے تھے اسے یوں سمجھیے کہ اصل لائن سے ایک شاخ نکالی گئی تھی جو اونچائی پر چڑھتی تھی اور آگے اسے روکنے کے لیے شہتیر سے لگائے گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی ٹرین بے قابو ہو کر دوڑ پڑے تو اس کا راستہ بدل کر اسے جہنم لائن پر ڈال دیا جائے تا کہ وہ چڑھائی پر کچھ دور تک جا کر آپ ہی رک جائے۔

ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ جہنم لائن تاریخ میں صرف ایک بار استعمال ہوئی۔ چمن سے یہ مال بردار ٹرین نیچے اتر رہی تھی کہ بے قابو ہوگئی اور لائن مینوں نے پٹری بدل کر اسے جہنم لائن پر ڈال دیا۔ ٹرین اونچائی پر چڑھی اور آخری رکاوٹ کو حقارت سے توڑتی ہوئی نیچے گہری وادی میں جا گری۔

کہتے ہیں کہ جہنم لائن پر اتاری جانے والی اس ٹرین میں چمن کے وہ سارے پھل لدے ہوئے تھے جن کا بہشت میں وعدہ ہے۔

ایسے دشوار راستے پر پہاڑ کاٹ کر یہ یکطرفہ لائن ڈالی گئی تھی مگر پورے راستے اس کے پہلو میں دوسری لائن ڈالنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ پہاڑوں میں سرنگیں بھی اتنی کشادہ کھودی گئی تھیں کہ ان سے بیک وقت دو گاڑیاں گزر سکیں مگر پھر انگریز چلے گئے اور وہ دوسری لائن ڈالنے کی نوبت آنا تو در کنار یہ واحد لائن ہی سلامت رہ جائے تو غنیمت ہے۔ مجھے لائن مینوں نے دکھایا کہ قدیم پٹڑیاں اور بوسیدہ سلیپریں ٹرین گزرنے کے وقت کانپتی ہیں۔ ضعیفی سے جیسے کمر دہری ہو جایا کرتی ہے۔

یہ وہی ریلوے لائن ہے جسے بچھانے کے لیے سروے کرنے والوں میں ہمارے ''امراؤ جان ادا'' کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا بھی شامل تھے۔ اس ریلوے لائن کے بارے میں مشہور ہے کہ 1935ء کے زلزلے نے اسے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ زلزلے کی وجہ سے ایک پُل بارہ انچ چھوٹا ہو گیا لیکن بالکل سالم رہا اور اس پر گاڑی چلتی رہی۔

پتا نہیں یہ لائن بچھانے والوں کی انجینئرنگ کا کمال تھا یا ان کی نیت کا اعجاز تھا۔

درہ بولان ختم ہوا۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی آ گیا جہاں سرکاری مہمان خانے میں میرے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ وہاں میں اس یقین کے ساتھ ٹھہرا کہ سیہون شریف کے سرکاری ریسٹ ہاؤس والا سلوک نہیں ہوگا۔ جہاں اچانک کوئی سرکاری افسر آ گیا تو مجھے بے دخل کر دیا گیا۔

اس شام سبی کا مشہور میلہ دیکھا جس میں میلہ کم اور لاؤڈ اسپیکروں کا شور زیادہ تھا۔ رات میں آرام سے سویا اور صبح تڑکے شیروں کی دہاڑ سے آنکھ کھلی۔ میلے میں لگی سرکس کے شیر سحر خیز نکلے۔

آگے چلے تو چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کے ساتھ لفظ ڈیرہ لگا دیکھا۔ ڈیرہ مراد جمالی یا ڈیرہ الہ یار۔ اس کے بعد جو اسٹیشن آئے ان کے نام کے ساتھ ٹنڈو لگا ہوا تھا۔ مطلب یہ کہ ہماری ریل گاڑی بلوچستان کو پیچھے چھوڑ کر سندھ میں داخل ہو گئی اور بالآخر جیکب سائیں کے شہر جیکب آباد پر رکی۔ پہلے اس کا نام خان گڑھ تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گڑھ تھا۔ ان پر قابو پانے کے لیے جنرل جان جیکب وہاں بھیجے گئے۔ انہوں نے نہ صرف حالات کو سنبھالا بلکہ شہر کو بھی اتنا نکھارا کہ لوگوں نے اپنے شہر کا نام بدل کر جیکب آباد کر دیا۔ عقیدت کا آج تک یہ حال ہے کہ جب بھی شہر کا پرانا نام خان گڑھ بحال کرنے کی کوشش کی گئی، شہر والے اڑ گئے کہ کچھ بھی ہو اس کا نام جیکب سائیں کے نام پر رہے گا۔ لوگ آج بھی ان کی قبر پر پھول چڑھاتے ہیں اور اگر کوئی بیمار ہو تو قبر کے گرد دھاگہ لپیٹ کر اور پھر اس کی بٹی بنا کر مریض کے گلے میں ڈال دی جاتی ہے، وہ دیکھتے دیکھتے اچھا ہو جاتا ہے۔

ایک گھنٹے بعد شکار پور اسٹیشن آ گیا۔ کسی زمانے میں ہندوستان کو وسطی ایشیا سے ملانے والی سڑک یہیں سے گزرتی تھی۔ اس دور کے پرانے نقشے میں جہاں اب پاکستان ہے، صرف دو شہر دکھائے گئے تھے۔ لاہور اور شکار پور۔ اب تو یہ شہر اپنی مٹھائی اور اچار کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس شام ٹین کے بھاری کنستر ٹرین پر چڑھائے جا رہے تھے۔ پتا چلا کہ ان میں اچار بھرا ہوا ہے۔ کسی نے بتایا کہ لوکی کا سبز حلوہ بھی اسی طرح منوں کے حساب سے جاتا ہے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ روہڑی تھا، روہڑی جنکشن۔ چار جانب سے آ کر ریلوے لائنیں یہاں ملتی ہیں۔ انگریزوں کا خواب پورا ہو گیا ہوتا تو افغانستان کے راستے وسطی ایشیا اور یورپ تک ٹرین یہیں سے چلا کرتی۔

رات سکھر کے ہوٹل میں گزار کر اگلی صبح میں دوبارہ روہڑی پہنچا جہاں اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ عرفان حسین صاحب کمال کے میزبان نکلے۔ کہنے لگے کہ اسے اپنا ہی اسٹیشن سمجھئے اور بتایئے کہ ہم آپ کے لیے کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اتنے بڑے اسٹیشن پر ریلوے کے پرانے پرانے ملازم موجود ہوں گے، مجھے ان سے ملوا دیجیے۔ دیکھتے دیکھتے پرانے ملازموں کی فوج آ گئی اور میں نے جی بھر کر انٹرویو ریکارڈ کیے۔

میں انٹرویو ریکارڈ کرنے کے معاملے میں کافی حریص نکلا۔ پچھلے ہر سفر نے مجھے یہ سکھایا کہ جو بھی ملے اس کی گفتگو ریکارڈ کر لو۔ بعد میں وہ گفتگو کام آئے یا نہ آئے، تمہاری اور گفتگو کی قسمت۔ بارہا یہ ہوا کہ بظاہر کسی غیر متعلق شخص کی غیر ضروری باتیں ریکارڈ کرالایا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہی گفتگو پورے پروگرام کی جان نکلی۔ مثلاً کانپور میں کمسن قائم رضا کی بوڑھی نانی کا یہ کہنا:

''مولا آئیں گے، ہمیں خود انتظار ہے کب آتے ہیں مولا''

روہڑی سے ملتان جانے کے لیے میں شالیمار ایکسپریس میں بیٹھا۔ اچھی اور آرام دہ ٹرین تھی۔ (سنا ہے بند کر دی گئی ہے کیونکہ حکومت کو گھاٹا ہو رہا تھا) پہلی بار دیکھا کہ مسافروں کو چلتی گاڑی میں ٹیلی ویژن دکھایا جا رہا تھا جس پر مسافروں کی فرمائش کے مطابق پروگرام چلائے جا رہے تھے۔ میں نے پروگرام چلانے والے جوان ارشاد احمد سے پوچھا کہ سب سے زیادہ فرمائش کس قسم کے پروگراموں کی ہوتی ہے۔ اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ لوگ گورے پہلوانوں کی کشتی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

راستے بھر میں کھانا کھلانے والے بیروں سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی ذاتی زندگی میں جھانک کر دیکھتا رہا جہاں دکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ مجبوری انسان سے سب کچھ کروا لیتی ہے۔ بیچارے کھانے کی ٹرے اٹھا کر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ فکر یہ نہیں تھی کہ ہر ایک کو کھانا مل جائے، تشویش یہ تھی کہ مسافر قیمت ادا کیے بغیر اُتر نہ جائیں۔

موقع ملے تو لوگ نہ صرف ہاتھ کی صفائی دکھا جاتے ہیں بلکہ دل ہی دل میں خود کو سمجھا بھی لیتے ہیں کہ کوئی ایسا بڑا گناہ نہیں کیا۔

رحیم یار خان کے اسٹیشن سے بے شمار مسافر ریل کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ سب نے نشستیں پہلے سے محفوظ کرا رکھی تھیں اور سب کی نشستوں پر پہلے سے کوئی نہ کوئی براجمان تھا۔

بہت جھگڑے ہوئے۔ بڑا شور شرابہ ہوا۔ یہ کیسی ریزرویشن تھی۔ میں نے حیران ہونا شروع ہی کیا تھا کہ پتا چلا کہ مرد الگ بیٹھیں گے اور خواتین کو علیحدہ بٹھایا جائے گا۔ مجھے بھی اپنی نشست چھوڑنی پڑی اور نئی نشست ایک سفید فام مسافر کے برابر ملی۔ میں نے سوچا کہ چلیے کچھ دیر اپنی انگریزی کی مشق کروں گا۔ وہ مسافر صاحب کوئی کتاب پڑھنے میں منہمک تھے۔ ذرا غور سے دیکھا تو حیرت ہوئی۔ وہ اردو کتاب تھی جس میں قدیم انبیاء کی حکایتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا "معاف کیجیے گا، آپ مسیحی ہیں؟"

بس اس کے بعد سارے بھید کھل گئے۔ وہ مسیحی مبلغ جان جبل تھے۔ آسٹریلیا کے باشندے تھے اور گیارہ سال سے پاکستان میں مسیحی مبلغوں کا تربیتی ادارہ چلا رہے تھے۔

انہوں نے صاف اردو میں بہت اچھا انٹرویو ریکارڈ کرایا۔ ان کا یہ فقرہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ ریل گاڑی کا عجیب و غریب چمتکار یہ ہے کہ اس میں بیٹھ کر سارے مسافر ایک کنبہ بن جاتے ہیں اور جب گفتگو کرنے لگتے ہیں تو اپنا دل کھول دیتے ہیں۔

ریل گاڑی کے تعلق سے مجھے یہ مقولہ بھی بہت بھلا لگا تھا اور مسلسل یاد آتا ہے کہ جب سے ٹرین چلی ہے، لوگ اپنی بیٹیوں کو دور دور بیاہنے لگے ہیں۔

اب میرا پڑاؤ ملتان میں تھا۔ وہاں تو کمال ہوا۔ اسٹیشن کا عملہ بڑا ہی میزبان تھا۔ اس نے کہا کہ اسٹیشن کو اپنا ہی سمجھیے۔ میں نے ملتان کینٹ کے اسٹیشن پر دو دن گزارے اور وہاں کام کرنے والے ہر شخص کی باتیں ریکارڈ کیں مگر ایک بات کا خیال رکھا۔ چونکہ انہوں نے جی کھول کر باتیں کی تھیں، میں نے ریڈیو پر کسی کا اصل نام نہیں بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے غیر معمولی تعاون کرنے والے سیدھے سادے ریلوے ملازم کسی مشکل میں پڑ جائیں۔

ملتان اسٹیشن کے باہر سائیکلیں کھڑی کرنے کا باقاعدہ اڈہ ہے جہاں دن بھر سائیکل رکھنے کی فیس صرف ایک روپیہ ہے۔ جس غریب ٹھیکیدار نے بھاری رقم دے کر اڈے کا ٹھیکہ لیا تھا، وہ اپنے دکھ بتاتے بتاتے رونے لگا۔ اس نے کہا کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ ایک روپیہ دیے بغیر سائیکل وہاں کھڑی کر جائے۔ خاص طور پر ریلوے ملازم کہتے ہیں کہ ہم پچیس سال سے سائیکل یہاں کھڑی کر رہے ہیں اور ہم نے آج تک ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ ٹھیکیدار نے وہاں ہونے والی ساری زیادتیاں گنوا دیں۔ میں نے ریڈیو پر اس کی پتا جوں کی توں نشر کر دی۔ اس پر حکام حرکت میں آگئے اور ٹھیکیدار کے دکھ دور کرنے کی بجائے اس کا جینا محال کر دیا۔ اس دکھیا نے مجھے خط لکھا

کہ میں مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ خدارا میری مدد کیجیے۔ میں نے چاہا کہ کچھ کروں، کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ملتان اسٹیشن پر سب سے دلچسپ مقام اس کا انگریزوں کے زمانے کا ٹی ہاؤس ہے جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ شہر کے سارے شاعر، ادیب اور صحافی وہیں بیٹھک جماتے ہیں۔ ایک بار تو کہتے ہیں کہ پلیٹ فارم پر مشاعرہ بھی ہوا۔ آتے جاتے مسافروں نے رات دیر تک مشاعرہ سنا۔ تانگے والے حیران تھے کہ مسافر اسٹیشن سے باہر کیوں نہیں نکل رہے ہیں۔ اس رات تانگے والوں کا نہیں، ملتان کے شاعروں کا کاروبار خوب چمکا۔

میں نے ایک بوڑھے قلی کی باتیں ریکارڈ کیں اور باہر نکل کر ایک تانگے والے کا تانگہ کرائے پر لیا تاکہ اس کی گفتگو بھی اپنی مشین میں محفوظ کرلوں۔ تانگہ چلتا گیا۔ گفتگو ہوتی رہی۔ بوڑھے عبدالغنی نے انگریزوں کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ وہ لوگ تانگے کا کرایہ نہایت دیانتداری سے دیتے تھے اور "ویل۔ تھینک یو۔" بھی کہتے تھے۔ آج کی سواریاں جھگڑا کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ دس روپے کی بجائے دو روپے میں کام چل جائے۔ ڈیڑھ روپے پر اصرار اس لیے نہیں کرتے کہ ادا کرنے یا لوٹانے کے لیے اٹھنی کا سکہ نہ سواری کے پاس ہوتا ہے اور نہ تانگے والے کے پاس۔

ٹرین نے سیٹی بجائی۔ میرے میزبانوں نے کہا کہ یہ کہہ رہی ہے کہ کوئٹہ بہت پیچھے رہ گیا۔ میں بولا "نہیں۔ یہ کہہ رہی ہے کہ کلکتہ بہت دور ہے۔"

بڑی بڑی باتیں تو سب ہی کو یاد رہتی ہیں۔ مجھے اُن چھوٹی چھوٹی باتوں سے والہانہ لگاؤ ہے جو نہ صرف یاد رہتی ہیں بلکہ یاد آ کر خوشیاں بھی دیتی ہیں، چھوٹی چھوٹی ہی سہی۔

ہماری گاڑی خانیوال پہنچ گئی۔ کیسا جیتا جاگتا اسٹیشن تھا۔ شہر کے لڑکے بن سنور کے آئے تھے اور زنانہ ڈبوں کے سامنے شوخیاں کر رہے تھے مگر مجھے وہ چھوٹا لڑکا خوب یاد ہے جس نے میرے کان کے قریب آ کر چائے کی آواز لگائی۔ میں نے کہا، میرے لیے چائے لے آؤ۔ وہ خوش ہو کر چائے لینے دوڑا۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ دوڑتے دوڑتے اس نے کہا "شکریہ۔"

اتنے چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے لڑکے کی زبانی ایسا سچا کھنکتا ہوا لفظ سنا تو جی

ہجوم اٹھا۔

اتنے میں ایک درویش صفت بزرگ آ گئے جن کے ہاتھوں میں جوتے پالش کرنے کا ساز و سامان تھا۔ بہت غریب تھے مگر تنگدستی کی شکایت نہیں کی۔ پولیس والوں کے جوتے پالش کر کے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ رہتے تھے۔ میری جیب میں ایک ایک دو دو روپے کے کچھ نوٹ تھے جو میں نے انہیں دے دیئے۔ لے کر چلے تو گئے لیکن کچھ دیر بعد دیکھا کہ واپس چلے آ رہے ہیں۔ آ کر میرے دیئے ہوئے نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ بولے "صرف عزت والا کام کرتا ہوں۔ یہ نہیں کہ کوئی غلط کام کروں۔" میں نے ان سے جوتوں پر پالش نہیں کرائی تھی اور انہیں محنت کے بغیر خیرات لینا منظور نہ تھا۔

میری گاڑی سرکنے لگی۔ میں کمسن چائے والے اور ضعیف عزت والے کو شکریہ بھی نہ کہہ پایا۔

خانیوال سے آگے میدان ہی میدان تھے۔ نہ کوئی پہاڑی نہ کوئی ٹیلہ۔ گاڑی جا بجا نہروں کے اوپر سے گزرتی تیر کی طرح سیدھی چلی جا رہی تھی۔ ملتان اور لاہور کے درمیان دو سو آٹھ میل لمبی یہ لائن سنہ 1864ء میں ڈالی گئی تھی۔ اس وقت یہ کام آسان نہ تھا۔ ٹھیکیدار اناڑی تھے۔ مزدور نایاب تھے۔ یہاں تک کہ پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ بچھانے کے لیے پتھر بھی دستیاب نہ تھے۔ تب لاہور کے مشہور ٹھیکیدار محمد سلطان نمودار ہوئے۔ انگریز ان سے بہت متاثر تھے کیونکہ انہیں جو کام بھی سونپا جائے راتوں رات مکمل کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہیں جتایا گیا کہ ریلوے لائن ڈالنے کے لیے اینٹیں اور پتھر درکار ہیں۔ محمد سلطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہڑپہ کے تاریخی آثار کھود کر پتھر نکال لائے اور لاہور میں مغل دور کی یادگار عمارتیں گرا کر اینٹیں فراہم کر دیں۔ عمارتی لکڑی درکار ہوئی تو کشمیر کے مہاراجہ سے سودا طے کر کے لکڑی منگا لی اور خود دولت کے انبار پر براجمان ہو گئے۔

انہوں نے آخری ستم یہ کیا کہ اینٹیں حاصل کرنے کے لیے مغل دور کی ایک مشہور مسجد گرا دی جو ستارا بیگم کی مسجد کہلاتی تھی۔ اس کے ساتھ مدرسہ بھی تھا اور حجرے بھی تھے۔ اس عمارت کا گرنا غضب ہوا۔ محمد سلطان کے بنے بنائے کام بگڑنے لگے۔ اتنے بڑے بڑے ٹھیکے ان کے بس کے نہ تھے۔ 1870ء تک وہ دیوالیہ ہو گئے اور پانچ سال بعد یوں مرے کہ کوئی حال پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ ان کی بنوائی ہوئی سرائے لاہور میں موجود ہے جو سلطان کی سرائے کہلاتی ہے۔

میں اس شام لاہور پہنچا تو میرے بی بی سی کے ساتھی شاہد ملک اور ان کے کچھ دوست مجھے لینے آئے تھے۔ اس وقت ان میں بحث ہو رہی تھی کہ عابدی صاحب اونچے درجے میں بیٹھے ہوں گے یا نیچے درجے میں۔ بہرحال وہ پلیٹ فارم پر اس جگہ کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے جہاں اونچے درجے کے ڈبے لگتے ہیں۔

اس شام انہیں مایوسی ہوئی۔

لاہور تو نہ صرف دیکھا بھالا بلکہ اپنا ہی شہر ہے۔ جگہ جگہ میلے کا سماں تھا۔ ہر قدم پر رونق تھی۔ خاص طور پر لاہور کا ریلوے اسٹیشن ایک خلقت کی گزرگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ اسٹیشن دیکھنے میں قلعہ نظر آتا ہے۔ اسے لاہور کے شاہی قلعہ کا پڑوسی ہونے کا شرف حاصل ہے مگر اس پر شاہی قلعے کا رنگ نہیں چڑھا ہے بلکہ یہ عمارت ان دنوں بنی تھی جب ہندوستان میں بغاوت کے شعلے اٹھتے نظر آ رہے تھے اور انگریز تیزی سے ریلوے لائن ڈال رہے تھے تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت آسان ہو جائے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت اس طرح بنائی گئی تھی کہ باغی اس پر حملہ کریں تو ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس وقت اسٹیشن کے دوسروں پر بڑے بڑے آہنی گیٹ لگائے گئے تھے جو رات کو بند کر دیے جاتے تھے۔ ویسے بھی اس زمانے میں ریل گاڑیاں صرف دن کے اجالے میں چلائی جاتی تھیں۔

اب اس حملے کا قصہ سنیے جو مجھ پر ہوا۔ لاہور میں میرا دوسرا دن تھا کہ میں نے اخبار میں پڑھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی، لیبر ونگ کے ریلوے انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات آج گیارہ بجے دوپہر ڈویژنل آفس لاہور میں ہوں گے۔

مذاکرات ہو رہے ہیں تو کچھ مسئلے بھی ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں مقررہ وقت سے پہلے لاہور کے ڈویژنل آفس جا پہنچا۔ ذرا سی دیر میں سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ لاہور ریجن کے تقریباً ایک درجن ٹکٹ چیکروں کو ترقی ملی تھی لیکن کئی مہینے گزرنے کے باوجود ترقی کے حکم پر عمل نہیں ہوا تھا۔ نہ کسی ٹکٹ چیکر کی اجرت بڑھی اور نہ حیثیت۔

یہ کہانی تو خود ٹکٹ چیکروں نے مجھے سنائی۔ میں ٹھہرا صحافی اور مجھ پر لازم تھا کہ دوسرے فریق کی بات سنوں اور اس کا موقف بھی معلوم کروں۔ ملازموں کا ایک وفد ایک اعلیٰ افسر کے کمرے میں گیا اور مذاکرات کیے۔ جب وفد باہر آ گیا تو میں بڑے ادب سے ان ہی اعلیٰ افسر کے کمرے میں داخل ہوا اور اپنا تعارف کرایا۔ خیال تھا وہ کہیں گے: بیٹھیے۔ انہوں نے کہا:

فرمایئے۔ میں نے کہا کہ میں ریلوے کے بارے میں ایک دستاویزی پروگرام تیار کر رہا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ لاہور ریجن کے ٹکٹ چیکرز کا کیا مسئلہ ہے؟

افسر اعلیٰ کے چہرے کا رنگ بدلا اور بولے "اگر لاہور ریجن کے ٹکٹ چیکرز کا کوئی مسئلہ ہے تو اس سے بی بی سی کو کیا؟"

میں نے کہا "میں نے ملازموں کا موقف سن لیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اب انتظامیہ کا موقف بھی سن لوں۔"

بولے "جی نہیں۔ میں کوئی انٹرویو نہیں دوں گا۔"

میں نے کہا "میں انٹرویو لینے نہیں آیا ہوں۔"

کہنے لگے "آپ کو کیسے پتا چلا کہ ٹکٹ چیکرز کا کوئی مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "آج کے اخبار میں خبر چھپی ہے۔"

بولے "وہ خبر میٹنگ کی ہے، مسئلے کی نہیں۔ آپ مجھے گمراہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں چلا جاتا ہوں۔"

اتنے میں ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف غالباً کوئی خاتون تھیں۔ انہیں بتانے لگے "بی بی سی لندن کے مسٹر عابدی آئے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ ٹکٹ چیکرز کا کیا مسئلہ ہے۔"

مجھے اسی لمحے محسوس ہو گیا کہ ٹیلی فون پر بولنے والی خاتون میری مداح ہیں لیکن اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی۔ میں لپک کر کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ سارے ٹکٹ چیکرز جو ابھی ذرا دیر پہلے وہیں دفتر کے سامنے گھوم رہے تھے، مجھے تنہا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک کو ڈھونڈ نکالا اور کہا "آپ کے یہ افسر کیسے ہیں؟"

کہنے لگے "یہ دراصل ایئر فورس کے افسر رہ چکے ہیں۔"

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ کیسی ایئر فورس کے کیسے افسر ہیں کہ بادل کے ایک ٹکڑے کو دشمن کا طیارہ سمجھ بیٹھے اور یہی نہیں، اس پر فائر بھی کھول دیا۔

میں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا مگر کبھی کسی کو رشوت لیتے نہیں دیکھا تھا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر یہ منظر بھی دیکھا۔ سرحد پار جانے والی سمجھوتہ ایکسپریس تیار کھڑی تھی اور مسافروں کو کسٹم اور امیگریشن کے مرحلے سے گزارا جا رہا تھا۔ ایک قطار ان لوگوں کی تھی جن

کے پاس ہندوستانی پاسپورٹ تھے۔ بیچ میں ایک پرانی، ناقص اور بوسیدہ میز رکھی تھی جس کی دوسری جانب امیگریشن کا ایک موٹا سا افسر کھڑا تھا جس کے پتلون کی پیٹی اس کے پیٹ میں دھنسی جارہی تھی۔

سامنے برقع پوش عورتوں کی قطار تھی، میلے لباس، اڑی ہوئی رنگت کے برقعے، میلے پیروں میں ربڑ کی سستی چپلیں، آنکھوں میں ویرانی، چہرے کی رنگت اڑی ہوئی، بڑھاپے کے باعث دانت چھدرے ہو گئے تھے جن پر عمر بھر کے کھائے ہوئے پانوں کا کتھا چونا جما ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں میلے کچیلے، مڑے تڑے پاسپورٹ لیے کھڑی تھیں۔ ایک ضعیف خاتون نے افسر کے آگے اپنا پاسپورٹ رکھا۔ افسر بولا "کتنے پیسے لائی ہو؟"

ضعیفہ نے بڑی عاجزی سے کہا "پاسپورٹ کے اندر ہیں۔"

افسر نے پاسپورٹ کھولا۔ اندر قائد اعظم کی تصویر والا سو روپے کا نوٹ تھا۔

افسر نے حقارت سے کہا "لے جاؤ اسے، تم نہیں جا سکتیں۔"

جب میں آگے بڑھا۔ بوڑھی عورتیں افسر کو بھیا بھیا کہہ رہی تھیں اور بھیا کی ایک ہی آواز آرہی تھی۔ "تم نہیں جا سکتیں۔ تم نہیں جا سکتیں۔"

میں خاموشی سے جا کر سمجھوتہ ایکسپریس میں بیٹھ گیا اور وہ جو کہتے ہیں کہ ٹرین میں بیٹھ کر لوگ دل کھول دیتے ہیں، میرے ساتھ وہی ہوا۔

ٹرین میں داخل ہوتے ہی کراچی کے حکیم سعادت علی صاحب ملے۔ فوراً ہی اپنی عمر جتائی: "اسی برس کی عمر ہونے کو آرہی ہے۔" خالص یوپی کا لہجہ تھا۔ لڑکے انہیں گھیرے بیٹھے تھے اور وہ ایک ایک کی نبض اور انگلیوں کے ناخن دیکھ کر پوشیدہ کمزوریوں کی تشخیص کر رہے تھے۔ مجھے بتانے لگے کہ جہاں جاتا ہوں لوگوں کو دوائیں دیتا جاتا ہوں۔ اب آپ اٹاری کے اسٹیشن پر ہندوستانی اہلکاروں کو دیکھیے گا۔ میری پوجا کرتے ہیں اور میرے ہاتھ پاؤں وغیرہ چومتے ہیں۔

وہیں ایک نوجوان ملا جس کا نام احسان الحق تھا۔ یوں اس کا تعلق ضلع فیصل آباد سے تھا لیکن وہ ہانگ کانگ میں رہتا تھا۔ ہر سال ٹرین کے ذریعے ہندوستان جاتا ہے اور ریلوے کا سارا عملہ اسے پہچانتا ہے۔ اس بات کا عملی ثبوت دینے کے لیے اس نے بھارت کے علاقے میں ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے والے گھڑسوار سپاہیوں سے دعا سلام بھی کیا (جنہوں نے نہایت سرد مہری سے جواب دیا) یہ سپاہی ٹرین پر نگاہ رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی پاکستانی جاسوس چپکے سے ہندوستانی علاقے

میں اتر نہ جائے۔

ٹرین یوں چلتی ہوئی جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو، اٹاری پہنچ گئی۔ ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ امیگریشن والے شاید ہر ایک کو جاسوس تصور کر رہے تھے، جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور ہتھیلیاں پھیلائی جا رہی تھیں تا کہ مٹھی کو سردی سے نجات ملے۔

میرا برطانوی پاسپورٹ تھا اس لیے سفید فام مسافروں کے بعد میری بھی گلوخلاصی ہوگئی۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حکیم سعادت علی اور احسان الحق کی کیسی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ حکیم صاحب کا تو دعویٰ تھا کہ بھارت میں امیگریشن والے ان کے بدن کے مختلف حصے چومتے ہیں۔ وہ اٹاری کے پلیٹ فارم پر بالکل یوں نظر آئے جیسے قیس کبھی صحرا میں حیران و پریشان گھومتا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ حکیم صاحب خیر تو ہے۔ بولے کہ یہ سُسرے کہتے فلاں کاغذ لاؤ، فلاں پر چہ دکھاؤ۔

اگلے منظر میں بھارت کے اہلکاروں سے صاحب سلامت کا دعویدار فیصل آباد کا احسان الحق دکھائی دیا بلکہ یوں کہوں کہ اس کا چہرہ فق دکھائی دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی داستان پوچھتا، کہنے لگا کہ میرے ویزے میں یہ نہیں لکھا کہ میں اٹاری کے راستے آؤں گا۔ یہ سالے کہہ رہے ہیں کہ واپس پاکستان جاؤ اور ہوائی جہاز کے ذریعے بھارت کا سفر کرو۔

ان دونوں کو ان کے ''سسرالی رشتے داروں'' کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میں امرتسر جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران ایک سکھ افسر میرے قریب آیا اور کہا ''امرتسر کی ٹرین تو آٹھ گھنٹے بعد آئے گی۔ آپ اسٹیشن کے باہر جاؤ۔ وہاں کا کا ٹیکسی والا کھڑا ہوگا۔ وہ ڈھائی سو روپے لے گا۔ بس آپ امرتسر چلے جاؤ۔''

اگلی صبح کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ میں نے ہال گیٹ کی بڑی اور تاریخی مسجد دیکھی، جلیانوالہ باغ دیکھا، گوردوارہ دربار صاحب دیکھا، ایک مسلم طعام خانے میں کھانا کھایا (سنا ہے کھانے کو ناقص کہنا گناہ ہے) میں ہاوڑا میل پر سوار ہونے کے لیے امرتسر کے اسٹیشن پہنچا تو پتا چلا کہ گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے۔ دوسری بات یہ دیکھی کہ جس پلیٹ فارم پر دو سو مسافروں کی گنجائش ہوگی، اس پر دو ہزار کا مجمع تھا۔ اوپر سے غضب یہ کہ لوگوں کے بیٹھنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ صرف پولیس کا بڑا سا کاؤنٹر تھا جس پر اصولاً مددگار عملے کو موجود ہونا چاہیے تھا لیکن پولیس ہر جگہ پولیس ہوتی ہے، وہ سارا عملہ غائب تھا اور ایک بڑا مجمع اس کاؤنٹر پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اس کے درمیان ایک جگہ بھی خالی

نہ تھی۔ میں دیر تک ہجوم کو کاٹ کاٹ کر پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ ایک ٹرین قادیان جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے اندر مسافر نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران میری ٹانگیں ڈکھنے لگیں۔ میں دوبارہ اس پولیس کاؤنٹر کے سامنے سے گزرا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر دراز تمام لوگ اتر کر جا چکے تھے اور مددگار عملے کا کاؤنٹر خالی پڑا تھا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور لپک کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجمع مجھے یوں دیکھ رہا ہے جیسے مجھ پر ترس کھا رہا ہو۔ اتنے میں اسی مجمع سے ایک پولیس افسر نکلا اور میرے قریب آیا۔ یہ افسر لاہور والے افسر سے بھی زیادہ موٹا تھا اور اس کے بڑے پیٹ میں بھینس کے مضبوط چمڑے کی پیٹی دھنسی جارہی تھی۔ میرے قریب آ کر ہندوستانی فلموں والے پولیس افسر کے لہجے میں بولا "کاؤنٹر پر کیوں بیٹھے ہو؟" میں نے کہا "کاؤنٹر پر آپ کی پولیس کے جس عملے کو بیٹھنا تھا وہ غائب ہے، کاؤنٹر خالی پڑا ہے۔ اس لیے تھکے ہارے مسافر اس پر بیٹھے ہیں۔" ایسے موقع پر فلمی پولیس افسر جس طرح آنکھیں نکال کر کہتا ہے: کیا؟ اس افسر نے بھی بالکل اسی طرح کہا: کیا؟ اور اپنی پیٹی سے ہتھکڑی کھولنے لگا۔

صاحبو! ہندوستان کے اس علاقے میں الہام کے قصے بہت سنے ہیں۔ اس وقت میرے کان میں بھی کسی نے کہا "جابر حاکم کے آگے کلمۂ حق کہنے والے، اپنا تھیلا اٹھا اور بھاگ۔"

میری ٹرین روانہ ہوئی تو رات ہو چلی تھی۔ مجھے راستے کے منظر دیکھنے کا بچپن سے جو شوق تھا اس نے آنکھیں موند کر صبر کر لیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی کہ نجیب آباد آ گیا۔ پلیٹ فارم پر اتر کر چائے پی اور ناشتہ کیا اور اپنا سامان سمیٹا کیونکہ ذرا دیر بعد ہی رام پور آنے والا تھا۔

رام پور اول تو اپنی گنبدوں اور محرابوں والی عمارت سے پہچانا گیا۔ اس کی دوسری پہچان وہاں کے قلیوں کا لب و لہجہ تھا: "قلی کیجیے گا؟ کہاں جائیے گا؟ چلیے ہم لے چلتے ہیں۔ اپنا سامان دکھ لیجیے۔ تانگہ کیجیے گا یا رکشا کیجیے گا۔"

میں تو نکلا تھا ریل کے سفر کے سارے ذائقے چکھنے کے لیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میری شامت وہاں میری ہی منتظر تھی۔ میں نے قلی سے کہا کہ اسٹیشن کے سامنے جو ہوٹل ہوتے ہیں، مجھے ان میں سب سے اچھے ہوٹل میں لے چلو۔ اس نے ایک ہوٹل کی اتنی تعریف کی کہ مجھے ڈر لگا کہ میں اس کے کرائے کا متحمل پاؤں گا؟

ہوٹل باہر سے ٹھیک لگا۔ اس کا استقبالیہ بھی مناسب تھا۔ وہاں اپنا اندراج کرا کے اور رقم ادا کر کے اب میں اپنے کمرے کی طرف چلا۔ کمرہ دکھانے والے سے میں نے پوچھا کہ یہ تو ٹوائلٹ ہو گیا، اب بتایئے کمرہ کہاں ہے؟

میں سمجھ گیا کہ عذاب مجھ پر نازل ہوا چاہتا ہے مگر پھر سوچا کہ ریل کی کہانی میں اسی طرح رنگ بھریں گے۔

شہر میں دن گزارنے کے بعد میں رات کو ہوٹل میں پہنچا۔ وہ بند پڑا تھا اور بجلی غائب تھی۔ دیر تک دروازہ پیٹا تو ایک ملازم نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا کہ کیا کمرے لینے آئے ہو؟ میں نے کہا کہ وہ تو صبح ہی لے لیا تھا، اب اس میں رہنے آیا ہوں۔

اندر یہ حال کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ میں نے ملازم سے پوچھا کہ ذرا دیر کے لیے اپنی ٹارچ دو۔ اس نے کہا کہ ہوٹل میں کوئی ٹارچ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی موم بتی دو۔ وہ اندر کہیں سے ٹٹول کر ایک موم بتی لایا جو کسی حسینہ کی شکستہ چھنگلیا سے بھی زیادہ نحیف تھی۔ اسے روشن کر کے میں نے اپنی سانس روک لی کیونکہ شمع کا یہ عالم تھا جیسے وہ بجھنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہو۔ اس میں بس اتنا دم تھا کہ کمرے کے دروازے تک پہنچتے ہی بجھ گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ پنکھا بند پڑا تھا اور ''اٹیچڈ باتھ روم'' کی بدبو منتظر تھی کہ کوئی ذی روح آئے اور اسے اپنی سانسوں میں اتارے۔ مچھروں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے میں ایک اور غضب ہوا۔ قریب کے کسی میدان میں دھارمک جلسہ شروع ہو گیا۔ کسی شخص نے ہارمونیم بجا بجا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر مذہبی گیت شروع کر دیے۔ وہ ختم ہوئے تو تقریر شروع ہوئی۔ اس کے بعد ایک تانتا بندھ گیا۔ پہلے گیت، پھر تقریر، پھر گیت، پھر تقریر اور بیچ بیچ میں فلاں کی جے، فلاں کی جے کے نعرے اس شان سے کہ لاؤڈ اسپیکر پر فلاں کی..... تو سنائی دیتا تھا، مجھے کی جے نہیں سنائی دیتی تھی۔ بار بار جی چاہا کہ کھڑکی سے اپنا آدھا دھڑ باہر نکالوں اور اس کا فقرہ مکمل کر دوں۔

خدا خدا کر کے اتنی روشنی ہوئی کہ گھڑی کی سوئیاں نظر آئیں۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے میزبان جلدی ہی مجھے لینے آ گئے اور میں سر پر پیر رکھ کر علاقے کے اس سب سے اچھے ہوٹل سے بھاگا۔

میں نے اپنے رام پوری میزبانوں سے پوچھا کہ شہر کی مسلم آبادی اس قسم کے رت

جھگڑے کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتی۔ جواب ملا کہ کبھی مسلم آبادی کی محفل نعت، محفل قوالی، محفل میلاد، محفل منقبت اور مجلس عزا سن کر دیکھیے اور شہر کی ہندو آبادی کے صبر و تحمل کو داد دیجیے۔

واقعی رام پور والوں کی شان ہی نرالی ہے۔

لکھنؤ آ گیا۔ کسی باذوق نے اسٹیشن کی عمارت شہر کی شاندار عمارتوں جیسی بنائی تھی۔ یہاں اتر کر ہم کبھی اسٹیشن کے باہر ہی گلاب میں بسی گٹھلیاں (جسے بدذوق ریوڑیاں کہتے ہیں) کھاتے تھے اور کیوڑے میں بسی سڑکوں پر چلتے ہوئے دھوپ میں خشک کیا ہوا سنہری امرس خریدا کرتے تھے (جسے بدذوق آم پاپڑ کہنے لگے ہیں)

اس روز میر تقی میر، انیس اور دبیر کے شہر میں اترا تو دیکھا کہ اسٹیشن کی ہر عبارت کو کھینچ تان کر ہندی کر دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کہیں ثقیل ہندی کا اتنا زور نہیں جتنا لکھنؤ میں ہے۔ اس کی نفسیات پر روشنی ڈالنا فضول ہے۔ No Exit کی جگہ لکھا تھا نکاس شدھ۔ انکوائری کی جگہ لکھا تھا۔ پوچھ تاچھ۔ (اسٹیشن کا اور آتی جاتی گاڑیوں کا نظارہ کرنے کی کوئی جگہ ہوتی تو وہاں لکھا ہوتا: تاک جھانک) آرام گاہ پر لکھا تھا واشرامالیہ اور آخری غضب ریز رویشن پر نازل ہوا۔ وہاں جو کچھ لکھا تھا، اردو رسم الخط میں لکھنا مشکل ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں: آرکشن۔

یہ سب پڑھتا ہوا میں باہر نکلا اور تانگے والے سے کہا کہ مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں کھانے کو کھانا اور پانی کو پانی کہتے ہیں۔

وہ مجھے چوک تک لے گیا اور سمجھا دیا کہ سیدھے چلے جائیے، وہاں آپ کو ٹنڈے کے کباب ملیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ اپنی دو خوبیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ لکھنؤ کی شامیں اور ٹنڈے کے کباب۔

کہنے کو یہ ٹنڈے کے لیکن درحقیقت بھینس کے کباب تھے جنہیں گلاوٹ لگا کر گلا لیا گیا تھا۔ بیرے نے میرے سامنے نان اور کباب لا کر رکھ دیے۔ میں نے کہا کہ یہ کباب آپ پیاز کے بغیر کھاتے ہیں؟ مجھے کتری ہوئی پیاز دیجیے۔

اس نے حیرت سے میری صورت دیکھی اور کہا کہ آج تک تو کسی نے پیاز نہیں مانگی۔ میں نے کہا کہ اصلی اور ملاوٹ والے لکھنؤ میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سامنے پیاز کی ڈھیری لگی

ہے۔ایک پیاز کتر کر لائیے۔

وہ پیاز آنا غضب ہو گیا۔ ہوٹل میں جو گاہکوں سے بھرا ہوا تھا، ہر طرف سے پیاز پیاز کا شور بلند ہونے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ آج پندرہ سال بعد بھی وہاں گاہک پیاز مانگتے ہوں گے بلکہ یہ بھی یقین ہے کہ اب ننھڈے کے جانشین گاہکوں کو بغیر مانگے ہی پیاز دینے لگے ہوں گے۔

لکھنؤ میں اب لکھنؤ والی کوئی بات نہیں رہی۔ صرف کا ئستھ دکاندار روایتی تہذیب اور اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں اور شہر کے شاندار ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہوا دربان ہر آنے والے کو جھک کر اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر آداب عرض کہتا ہے ورنہ سب کچھ بدل گیا ہے۔

میں چوک میں دیر تک چلتا رہا۔ ہر عمارت میں نیچے دکانیں تو ہیں لیکن اوپر کوٹھے نہیں ہیں۔ نہ طبلے کی تھاپ ہے نہ سارنگی کی تانیں، نہ ٹھمری کی لَے ہے نہ دادرے کے بول۔ بس شور شرابہ ہے، خاک دھول ہے اور چاندی کے ورق کوٹے جانے کی ٹھک ٹھک ہے۔

میں چھوٹا بڑا امام باڑہ اور وثیقہ آفس دیکھتا ہوا واپس اسٹیشن چلا گیا کیونکہ وثیقہ آفس سے میری بوڑھی پھوپھی کو جو آٹھ آنے ماہانہ ملا کرتے تھے، اب میں نے مطالبہ کیا تو شاید دوونی بھی ہاتھ نہ آئے۔

گاڑی رات بھر چلی اور صبح تڑکے بنارس پہنچی۔ وہی بنارس جہاں رسوائی سے بچنے کے لیے مثنوی زہر عشق کی سوداگر زادی کو بھیجنے کے مشورے ہو رہے تھے اور وہی بنارس جہاں مرزا غالب نے کچھ روز قیام کیا تھا اور لکھا تھا کہ عہد جوانی میں ادھر آیا ہوتا تو یہیں کا ہو رہتا۔

میں نے بھی اپنے ریل گاڑی کے سفر کے دوران وہاں کچھ روز قیام کیا اور وہیں کا ہو رہنے کا مجھے ذرا سا بھی ارمان نہیں۔ جس روز میں وہاں پہنچا، گنگا کے کنارے دور سے نظر آنے والے اورنگزیب کی مسجد کے مینار پرانے ہو کر گر چکے تھے اور شہر میں اس مسجد کے گرد سخت پہرہ تھا جس کے بارے میں خیال ہے کہ کوئی مندر گرا کر اس کے کھنڈر کے اوپر بنوائی گئی تھی۔ قریب کی ساری چھتوں پر بندوق بردار پولیس کھڑی تھی اور ذرا ٹھہر کر مسجد کو دیکھنے والوں کو تیزی سے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔

میں ڈرا ہوا تھا۔ میری سائیکل رکشہ والا محمد اقبال مجھ سے بھی زیادہ خوفزدہ تھا۔ اس نے

مجھے ہوٹل تک پہنچا دیا جہاں میں نے اس سے کہا کہ صبح تڑکے آ کر مجھے لے جانا۔ دوسرے رکشہ والے کان کھڑے کیے یہ باتیں سن رہے تھے۔ چنانچہ کسی کاشی رام یا دھرم پال یا جوگندر سنگھ نے رات کو محمد اقبال کے رکشہ کے پہیوں میں پن گڑو دیے۔

پنکچر درست ہوئے تو میں گنگا کے گھاٹ دیکھنے پہنچا۔ جس طرح لکھنؤ میں شام لکھنؤ نہ ملی، بنارس میں بھی صبح بنارس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لکھنؤ کی فضا میں موٹر گاڑیوں کا دھواں بھرا ہوا تھا، بنارس میں گنگا کے کنارے جلنے والی لاشوں کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ سنہرے روپہلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی باقی ارتھیاں قطار میں لگی اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔ غریب غربا شمشان گھاٹ کی راکھ کرید کرید کر سونے چاندی کے ذرے جمع کر رہے تھے۔ دریا میں ایک ادھ جلی لاش تیر رہی تھی جس کے مڑے ہوئے گھٹنے پر بیٹھا ہوا ایک کوا اس کا گوشت نوچ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ مرنے والے کو اس سے کیا غرض، وہ تو گنگا جل میں پوتر ہو کر سورگ کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔

بنارس سے کلکتے جانے کے لیے میں اسٹیشن پر پہنچا تو کئی ہزار مسافر مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر مشکل سے پیر ٹکانے کی جگہ ملی لیکن اس گابھن گائے کو ذرا سی بھی مشکل نہیں ہوئی جو مجمع میں گھسی اور لوگوں کو کولہا مارتی ہوئی نکل گئی۔ اسے نہ ٹکٹ کی ضرورت تھی نہ ذبح ہونے کا خوف۔

ٹرین چلی تو بہار کے کھیتوں، کھلیانوں اور میدانوں کی سیر شروع ہوئی۔ قدم قدم پر چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آنے لگے۔ ہر اسٹیشن پر موجود سیکڑوں مسافر اپنی گاڑی کے آنے سے بہت پہلے آ گئے تھے۔ اچانک میدانی علاقہ ختم ہوا اور ٹیلے نظر آنے لگے۔ کسی نے کہا کہ بہار گزر گیا، یہ بنگال ہے۔ اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اب تک ہر اسٹیشن پر اس کا نام ہندی، انگریزی اور اردو میں لکھا ہوا تھا، اچانک اردو کی جگہ بنگالی نظر آنے لگی۔

راستے میں بردوان آیا جہاں نور جہاں رہتی تھی اور شیر افگن مارا گیا تھا۔ راہ میں چترنجن بھی آیا جہاں ریل کے انجن بنا کرتے تھے۔ خدا جانے ریل کے ڈبے کہاں بنتے ہوں گے۔ اس ردیف قافیے کا کوئی شہر میرے ذہن میں نہیں آیا۔

چلتے چلتے میری گاڑی ہاوڑا پہنچ گئی۔ دنیا اسے کلکتہ سمجھتی ہے۔ کلکتہ تو دریا پار تھا۔ انگریز اس پر ٹرین کا پل نہ بنا سکے۔ اس لیے کلکتے کا اسٹیشن اس گاؤں میں بنایا گیا جس کو آج تک ہاوڑا

کہا جاتا ہے۔

کلکتہ میں دس برس پہلے بھی آیا تھا۔ مجھے "جرنیلی سڑک" کے آخری سرے کی تلاش تھی۔ پہنچا تو شہر والوں نے دعویٰ کیا کہ یہاں جرنیلی سڑک کا پہلا سرا ہے۔ یہ تاریخی سڑک کلکتے میں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

البتہ برصغیر میں ریل گاڑی کا جو جال بچھا تھا، اس کا پہلا سرا کلکتے ہی میں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہاں سے پہلی تاریخی گاڑی چلانے کا وقت آیا تو انگلستان سے ریل کے ڈبے لانے والا سمندری جہاز دریائے ہگلی میں ڈبوں سمیت ڈوب گیا اور انہیں کھینچنے والا انجن لانے والا جہاز بھولے سے آسٹریلیا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوڑ میں شہر بمبئی سبقت لے گیا۔ (16 اپریل 1853ء) ہاوڑا سے پہلی مسافر گاڑی 3 فروری 1855ء کو نکلی۔

اسی مقام اور اسی ٹھکانے کے لیے اب جو میں دس سال بعد دوسری بار کلکتہ پہنچا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ دس سال پہلے یہ کھلا ڈھلا شہر تھا، اس بار مجھ سے پہلے آتنک وادیوں کا خوف یہاں پہنچ چکا تھا۔ دہشت گرد اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔

کلکتے میں میرے میزبان اردو کے شاعر اور سی آئی ڈی کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ بادہ خوار نہ ہوتے تو ولی ہوتے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے شہر کی صورتحال سمجھائی۔ مثال کے طور پر یہ بتایا کہ ایک نوجوان ہاوڑا کے پل کی تصویر اتارتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے ٹاڈا نامی ایک قانون کے تحت جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اب بوڑھا ہو کر رہائی پائے گا۔

میں اسٹیشن دیکھنے چلا تو سادہ کپڑوں میں ملبوس سی آئی ڈی کے چار اہلکار میرے ساتھ کر دیے گئے۔ اب عالم یہ تھا کہ میں ان کے محاصرے میں چل رہا تھا۔ اوپر سے غضب یہ کہ مجھے بتا دیا گیا کہ نہ اپنا ٹیپ ریکارڈر تھیلے سے نکالوں نہ اپنا کیمرہ۔ غنیمت ہے کہ مجھے آنکھیں کھلی رکھنے کی اجازت تھی۔

تو صاحبو! ہاوڑا کے اسٹیشن کا منظر اس روز یہ تھا کہ ہزاروں مسافر، آنے والے بھی اور جانے والے بھی، مسلسل لپک رہے تھے۔ مال سے لدے پھندے دکاندار، دودھ کے برتن اٹھائے ہوئے گھوسی، دفتروں کو جانے والے بابو لوگ، امتحان کے خوف سے بوکھلائے ہوئے طالب علم، آگے آگے شوہر، پیچھے پیچھے ساڑھی میں لپٹی ہوئی نئی نویلی دلہن، فقیر، سادھو، سنیاسی، آوارہ گائیں اور ننگ دھڑنگ دیوانے، سبھی کو کسی بات کی جلدی تھی۔ ان سے زیادہ جلدی میرے

چار محافظوں کو تھی۔ شاید میری طرح انہیں بھی ٹاڈا کا خوف تھا۔

نہ میں کسی کا انٹرویو کر سکا۔ نہ کوئی منظر اپنے کیمرے میں اتار پایا۔ یوں لگا کہ جلدی جلدی اپنا فرض ادا کیا اور میرے میزبان یعنی سی آئی ڈی کے حاکم کو مطلع کیا کہ ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے۔

شام کو جب میں ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا اور پیالے طلوع ہو چکے تھے۔ میرے میزبان کے ہم مشرب آ چکے تھے اور محفل رنگ پر آ رہی تھی۔ اس دوران یہ خبر آ چکی تھی کہ رات کی تاریکی میں کوئی نامعلوم ہوائی جہاز مغربی بنگال کے کسی علاقے میں کچھ ساز و سامان گرا کر چلا گیا ہے۔ ذرا دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ خبریں آنے لگیں، اطلاعات جانے لگیں۔ بالآخر میرے میزبان نے کسی متعلقہ حاکم کو باضابطہ اطلاع دی کہ تاریکی میں اڑان بھرنے والا جہاز پاکستانی تھا۔

جو اہلکار پوری طرح ہوش میں تھے، انہوں نے اگلے روز اطلاع دی کہ جہاز سوویت یونین کی کسی جمہوریہ کا تھا اور علیحدگی پسندوں کے لیے کچھ ساز و سامان گرا گیا ہے۔

میں نے خود اپنا ساز و سامان تیزی سے سمیٹ کر سوٹ کیس میں بند کیا۔ اس دوران میرے میزبان نے یہ عنایت کی کہ اتوار ہونے کے باوجود گراموفون کمپنی آف انڈیا یعنی ہز ماسٹرز وائس جیسے ریکارڈ بنانے والی ڈم ڈم کی تاریخی کمپنی کی دکان خاص طور پر کھلوائی جہاں سے میں نے پرانے گانوں کے ریکارڈ خریدے اور یہ یقین کرنے کے بعد کہ ہوائی جہاز والے ان ریکارڈوں پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے، کلکتے کو خیر باد کہا۔ یہ ضرور ہے کہ چلتے چلتے رام لیلا گراؤنڈ پر گول گپے کھائے جو اتنے بڑے تھے کہ اس قدر منہ کھولنا مشکل تھا۔ ویسے بھی جہاں ٹاڈا جیسا قانون لاگو ہو، منہ نہ ہی کھولا جائے تو اچھا ہے۔

---------O---------

گلوں کی خوشبو

بی بی سی سے وابستگی کے دوران میں نے چار بڑی کتابیں لکھیں۔ ان چاروں کی بنیاد میرے پیش کیے ہوئے چار اہم پروگراموں پر تھی۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''کتب خانہ'' تھی جسے کراچی میں اسماعیل سعد صاحب نے شائع کیا۔ میری دوسری تصنیف ''جرنیلی سڑک'' تھی۔ اس کے ناشر بھی اسماعیل سعد صاحب ہی تھے۔ انہوں نے یہ کتابیں بڑے سلیقے سے چھاپیں۔ اسی دوران ہمارے دور کے بڑے کہانی کار انتظار حسین لندن آئے اور میں نے انہیں ''جرنیلی سڑک'' کا ایک نسخہ پیش کیا۔ وہ کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ چنانچہ راستے بھر انہوں نے یہ کتاب پڑھی اور لاہور پہنچ کر انہوں نے سنگِ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں افضال اور اعجاز سے جرنیلی سڑک کا ذکر کیا اور اصرار کیا کہ وہ میری دونوں کتابوں کی اشاعت کے حقوق حاصل کریں۔ بس اس کے بعد ایک دو کے سوا میری ساری کتابیں لاہور سے شائع ہوئیں۔

''کتب خانہ'' کی تعارفی تقریب کا اہتمام اسماعیل سعد صاحب نے کراچی میں کیا۔ ''جرنیلی سڑک'' کی تقریب تعارف لندن میں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد میری بی بی سی کی ساتھی ثریا شہاب نے اسلام آباد میں بھی ''جرنیلی سڑک'' کے اجراء کی تقریب منعقد کی جس میں ان لوگوں کو بلا کر شریک کیا گیا جن کا کتاب میں تذکرہ تھا۔

اس کے بعد میری تیسری کتاب ''شیر دریا'' شائع ہوئی۔ عموماً اس طرح کی تقریبیں بڑے بڑے شہروں میں ہوا کرتی ہیں لیکن میں اپنی یہ کتاب لے کر ان دور دراز شہروں میں پہنچا جو دریا کے سفر کے دوران راہ میں پڑے تھے۔ اس طرح ''شیر دریا'' کی تعارفی تقریب لاہور کے بعد میانوالی، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان اور ملتان میں انجام پائی۔

یہ تین کتابیں ریڈیائی پروگرام کے مسودے کا عکس تھیں۔ ان میں کوئی کمی بیشی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ چوتھی کتاب ''ریل کہانی'' کا قصہ مختلف ہے۔ کوئٹہ سے کلکتے تک

ریل کے سفر کا احوال سنانے کے لیے مجھے بہت کم وقت ملا تھا جبکہ میں نے لمبی چوڑی ریسرچ کی تھی اور بہت سی دلچسپ باتیں ریڈیو پروگرام میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں جس کا مجھے قلق تھا۔

آخر یہ ہوا کہ جب میں اس پروگرام کو کتاب کی شکل دینے بیٹھا تو وہ ہزار دلچسپیاں اس میں حلول کر گئیں اور اس طرح میں "ریل کہانی" کو اپنی چہیتی تصنیف تصور کرتا ہوں۔ اس دوران میں بی بی سی سے ریٹائر ہو گیا اور "ریل کہانی" کی نہ کوئی تعارفی تقریب ہوئی نہ کوئی منہ دکھائی۔ خیر! اس کا مجھے اس لیے افسوس نہیں کہ میرے قارئین نے نہ صرف کتاب پڑھی بلکہ مجھے ایک نوجوان کی بات یاد ہے، جس نے فون کر کے مجھ سے کہا کہ "ریل کہانی" آپ کی بہترین کتاب ہے۔

نوجوان کی یہ بات بالکل اسی طرح یاد ہے جیسے اکابرین اور دانش وروں کے تبصرے جو انہوں نے تقریر اور تحریر کی شکل میں پیش کر کے مجھے ممنون کیا۔ آج ان کی باتیں دہرا کر میں اس لیے اور بھی زیادہ شکر گزار ہوں کہ ان میں سے کئی یگانہ روزگار شخصیتیں اب ہمارے درمیان نہیں۔ جو گزر گئے وہ یاد آتے رہیں گے، جو موجود ہیں اللہ میاں انہیں صحت و توانائی کے ساتھ جیتا رکھے...

اگلے صفحات میں کچھ تبصرے نقل کر رہا ہوں کہ دانش مندی کی باتیں کرنا بھی کارِ ثواب ہے اور انہیں دہرانا بھی کسی نیکی سے کم نہیں۔

---------O---------

جرنیلی سڑک۔ زندگی بھر کی یادیں

الطاف گوہر

رضا علی عابدی نے کیا کتاب لکھی ہے، ہر صفحے پر جیسے رنگا رنگ شگوفے کھل رہے ہوں، دھیمے مزاج کے، لطیف نکتوں کے اور جذب میں ڈوبے ہوئے مشاہدات کے۔ کیسی سادہ زبان میں کتنی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔ کتاب پڑھ کر مصنف کے ایک تاریخی شاہراہ سے جذباتی لگاؤ کا اندازہ بھی ہوا اور یوں بھی لگا جیسے پشاور سے نکلتے تک تمام راستے زندگی بھر کی یادیں بھورے بادلوں کی طرح ساتھ چلی آ رہی ہوں۔

رضا علی عابدی ہلکے سے ایک تار چھیڑ دیتے ہیں اور ذہن میں پورا ساز یہ جھنجھنا اٹھتا ہے، بول سلگنے لگتے ہیں، خیال لہراتے ہیں اور دھوپ میں جلتی ہوئی شاہراہ یادوں کا ایک سلسلہ بن کر دہکنے لگتی ہے۔

اسی سڑک کے کنارے گوجرانوالہ کا شہر ہے، کوے کی اڑان سے اگر آپ اندازہ لگائیں تو جس حویلی میں میں نے آنکھ کھولی وہ سڑک سے کوئی دو ہزار گز دور ہوگی اور اگر کوا رنجیت سنگھ کی سمادی کو کاٹتا ہوا نکلے تو فاصلہ دو چار سو گز سے کم ہو جائے۔ حویلی کے سامنے ایک کنواں تھا، جب میں نے پڑھنا سیکھا تو کنویں کی دیوار پر یہ عبارت دیکھی "چاہ بی بی صغرا۔"

اپنی پھوپھی کا نام تو میں نے پہچان لیا لیکن چاہ کے معنی بعد میں معلوم ہوئے۔ اسی حویلی میں میں نے اپنی والدہ سے فارسی کا پہلا شعر سنا جسے وہ ہولے ہولے پڑھتی رہتی تھیں:

آہستہ برگ گل بہ فشاں برمزار ما
بس نازک است شیشۂ دل درکنار ما

اس کے معنی بھی چالیس برس بعد سمجھ میں آئے۔

عابدی صاحب نے یہ تو بتا دیا کہ گوجرانوالہ میں ہری سنگھ نلوے کا مکان ہے اور یہ نلوہ سکھوں کی تاریخ کا سب سے بڑا جرنیل اور ناظم سردار تھا مگر یہ نہ بتایا کہ شیر شاہ کی بنائی ہوئی شاہراہ

جو انگریزوں کے عہد میں گرینڈ ٹرنک روڈ قرار پائی وہ جرنیلی سڑک کب اور کیسے کہلانے لگی۔

اگر وہ نور جہاں کے اس گانے "کرنیل نی، جرنیل نی" پر غور کرتے تو فوراً جان جاتے کہ اس سڑک کو جرنیلی کس نے بنایا ہوگا۔ یہ کام نہ پشاور کے پٹھانوں کا اور نہ دلّی کے کرخنداروں کا ہوسکتا ہے۔ خواجہ منظور حسین کی تحقیق سے ثابت ہے کہ غدر کے زمانے تک اردو شاعر اور نثر نگار جنرل کو جنرل ہی لکھتے رہے۔ میں نے ایک پٹھان دوست سے پوچھا کہ پشاور والے اس سڑک کو جرنیلی کیوں کہتے ہیں، وہ بولے کہ اسی راستہ سے تو سکھوں کے جرنیل اور لشکر آیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی فوجوں کے کمانڈر سپہ سالار یا سردار کہلاتے تھے۔ سکھوں نے دھڑلے سے کرنیل سنگھ اور جرنیل سنگھ جیسے نام اختیار کیے اور اپنے جرنیلوں کو انگریزوں کے سامنے صف آرا کر دیا۔ بغیر تحقیق کیے میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس تاریخی شاہراہ کو جرنیلی سڑک کا لقب دینا گوجرانوالہ کے سکھوں کا کام معلوم ہوتا ہے۔

مجھے یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ عابدی صاحب کو گوجرانوالہ میں ایک چینی ریستوراں میں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے زمانے میں آتے تو ہم انہیں مکھن کے پیڑوں میں رچی ہوئی لسی پلاتے اور جب لسی کا جگ اٹھانے میں انہیں دقت ہوتی تو ہم ان کا کندھا تھپتھپا کر کہتے "پہلوان لسا ہو گیا ایں، کھاڑے آیا کر" (مہربان کچھ کمزور ہو گئے ہو، کسرت کیا کرو) چینی اس زمانے میں بھی گوجرانوالہ کا پھیرا لگاتے تھے مگر بیچتے صرف دوائے دل تھے۔

اسی سڑک کے کنارے وہ اسکول تھا جہاں صبح سویرے تین میل پیدل چل کر جاتا اور راستے بھر یہ اشتہار پڑھتا "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" اسی لیے چائے پینے کو صرف اسی حالت میں ملتی تھی جب آدمی کا جسم بخار سے تپ رہا ہو۔ یہیں وہ اکھاڑا تھا جہاں رحیم پہلوان نے ایک دیو ہیکل انگریز مدمقابل کو پلک جھپکنے میں پاؤں کی "اکھیڑ" سے چت کر دیا تھا اور یہیں جب استاد نور الدین پہلوان کی کشتی برابر چھڑوا دی گئی تو "نورا کشتی" کا محاورہ ایجاد ہوا۔ اسی سڑک کے کنارے میں نے بائی اسکوپ پر پہلی خاموش فلم دیکھی اور آمین بالجہر کہنے پر دو نمازیوں کو جبراً مسجد کے حوض میں اتارے جانے کا ایمان افروز منظر بھی دیکھا اور خلافت کے زمانے میں وہ جلوس بھی دیکھا جس میں ایک جید عالم نے جب گرفتاری سے بچنے کے لیے بیماری کا عذر پیش کیا تو لوگوں نے شور مچا دیا "ہن کُش نیں ہوسکدا، ہار پے چکے نے، گرفتاری دینی پے گی۔" (اب کچھ نہیں ہو سکتا، ہار پڑ چکے ہیں، گرفتار ہونا پڑے گا۔)

بات دراصل یہ تھی کہ اُس زمانے میں ہار پھولوں کے نہیں پھلوں اور نوٹوں کے ہوتے تھے اور لوگ اپنے سیاسی رہنماؤں سے جانثاری کا عملی ثبوت طلب کرتے تھے۔ کیا وقت تھا کہ بچے گلیوں میں گاتے پھرتے تھے "غازی مصطفےٰ پاشا کمال وے، تیریاں دور بلائیں" اور یہ خبر ابھی گوجرانوالہ تک نہیں پہنچی تھی کہ خلافت کی بساط کوئی دو سو برس پہلے اُلٹ چکی تھی اور غازی کمال پاشا بچے کھچے مہروں کو اٹھانے میں لگے ہوئے تھے۔

اسی سڑک کے کنارے مصری شاہ کا علاقہ ہے جہاں وہ دل کا اُجلا چاند، قیوم نظر ابھرا تھا۔ کیا صاحب طرز شاعر تھا۔ گفتار اور کردار دونوں کا غازی، آج وہ چاند درد کا داغ بن گیا ہے۔ اب بھی کانوں میں اس کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ آج اسے مرحوم کہتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اس تاریخی شاہراہ کا ایک اور حصہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا ہے۔

اردو مرکز کی ایک محفل میں میں نے عرض کیا تھا کہ موسم گرما میں ادیب اور مولوی سرزمین برطانیہ پر یوں اترتا ہے جیسے مرغابی، اب معلوم ہوا کہ ادیب تو مرغابی کی طرح واپس لوٹ جاتا ہے، مولوی آجائے تو پھر نہیں جاتا۔ وما علینا الا البلاغ۔ مولوی کے نہ جانے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ سفرنامہ نہیں لکھتا۔ ادیب تو گھر بعد میں پہنچتا ہے، قسط وار سفرنامہ پہلے ہی لکھنے لگتا ہے تاکہ وطن والے آگاہ رہیں کہ وہ کہاں کہاں اپنی آواز اور فکر کا جادو جگا رہا ہے۔ ان سفرناموں کا سیاحت سے زیادہ سیر سپاٹے سے تعلق ہوتا ہے۔ شاید رضا علی عابدی اسی لیے کہتے ہیں کہ "جرنیلی سڑک" سفرنامہ نہیں ہے، یہ تو ایک حساس دل اور ذہن کی سیدھی سی گفتگو ہے۔

کس محبت اور کاوش سے رضا علی عابدی نے صدیوں پرانی عمارتوں کو نہ صرف پہچانا ہے بلکہ ایک بار پھر اُن کو آباد کر دیا ہے۔ مجھے تو یوں لگا کہ رہتاس کے قلعے کی تعمیر 25 مئی 1542ء کو صبح سات بجے نہیں، 1987ء میں رمضان کے مہینے میں رضا علی عابدی کی موجودگی میں شروع ہوئی اور انہی کی تجویز پر "ٹوڈرمل کھتری نے پتھر لانے والوں کو ہر پتھر پر ایک اشرفی دینے کا اعلان کیا اور دیکھتے دیکھتے رہتاس کے دروازے، بُرج اور فصیلیں آسمان کو چھونے لگیں اور یوں وہ راستہ بند ہوا جس پر سکندر اپنی کشتیاں اور بابر اپنی توپیں کھینچتا ہوا گزرا تھا۔"

اور جب یہ سیاح شیر شاہ کے شہر سہسرام پہنچا، احتراماً قریب کے پہاڑ نیچے اور دور کے پہاڑ اونچے ہو گئے اور سیاح نے اعلان کیا کہ رہتاس کا معمار آ پہنچا ہے، اب وہ سہسرام کے

رہتاس کی عمارت بھی اپنے سامنے بنوائے گا۔ لوگوں نے کہا، حضور اب وہاں کوئی نہیں جاتا، وہاں اب ڈاکو رہتے ہیں۔ سیاح نے کہا، کوئی حرج نہیں، ہم فی الحال سامنے کیمور کی پہاڑیوں کو سر کر لیتے ہیں۔ چوٹی پر پہنچے تو کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ ایک آرام گاہ نظر آئی۔ "برسات کی جھڑی لگتی ہے تو شہر والے اپنے گھر چھوڑ کر وہاں اوپر پہنچ جاتے ہیں، برساتی جھرنوں کے شور سے آواز ملا کر بارہ ماسہ گاتے ہیں اور نوجوانوں کی ٹولیاں وہیں رہ جاتی ہیں اور ساون کی گھن گرج اور کڑکتی بجلیاں اُن کے لوں میں اور جولانی بھرتی ہیں۔" سیاح نے سوچا کہ اب آیا تو برسات میں آؤں گا۔

مکان اور مکین، بازار اور گلیاں، دکاندار اور خریدار، رکشہ والے، بسوں کے ڈرائیور، شاعر، ادیب، استاد، طالب علم اور پرانی روایتوں کے امین ایک ایک کر کے آپ کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں اور آپ بھی ان میں شامل ہو کر تاریخ کے ایک باب اور تہذیب کے ایک دور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ہر فنکار کا اپنا اپنا طریق واردات ہے۔ رضا علی عابدی "خفیہ گوئی" کا استاد ہے یعنی وہ آخری لمحے تک سب سے اہم تفصیل کو آستین میں چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ آگرے کے ایک شاعر کی تلاش میں نکلتا ہے، اکبر اور شاہجہاں کے قلعے کی شوکت و عظمت کو سراہتا، جہاں آرا بیگم کے بے مینار مسجد کے تین بڑے گنبدوں کی سربلندی کا دم بھرتا، میں آگے بڑھا، بیچ چوراہے میں ٹوپی اور داڑھی والے کسی شخص کا مجسمہ نظر آیا، میں نظیرا کبرآبادی سمجھا، وہ شیواجی نکلے۔"

ایک اور مثال: "پشاور سے اگر آپ جرنیلی سڑک پر کلکتے تک جائیں تو راہ میں زبان، ادب، روایت، پہناوا، رسم و رواج اور قدریں سب کچھ بدلتا جاتا ہے مگر ایک چیز اس پندرہ سو میل لمبے رستے میں ہر جگہ موجود ہے اور وہ ہے گنے کا رس..... مگر سب سے لذیذ رس الہ آباد کا تھا۔ اس میں شہد کی مکھیاں بھی بے دریغ پس رہی تھیں۔ رس پینے والا کوئی شکایت یا احتجاج نہیں کر رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ رس نکالنے والوں نے مشہور کر دیا ہے کہ اس قسم کا رس پینے سے سوئی ہوئی توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔" اس ایک تفصیل نے الہ آباد کے کاریگروں اور ان کے گاہکوں کے کتنے ہی راز فاش کر دیے۔

"کہتے ہیں کہ اسی الہ آباد کے ایک سپوت نے کہ جس کا نام بنجے گاندھی تھا، اپنی زندگی میں یہ طے کیا تھا کہ جس طرح جے پور گلابی شہر کہلاتا ہے، ہر بڑے شہر کا اپنا رنگ مخصوص کر

دیا جائے، اس کی تمام عمارتوں پر وہی رنگ پوتا جائے اور اس طرح ایک ایک رنگ ایک ایک شہر کی پہچان بنے۔ مثلاً کانپور کو ہرا شہر قرار دیا گیا اور منادی کرادی گئی کہ لوگ اپنی دیواروں پر ہرا رنگ پھیریں۔ اب تک وہاں ہر محلے کی اکادکا عمارتیں ہری نظر آتی ہیں۔ شہر الٰہ آباد کو بآسانی کتھئی شہر قرار دیا جاسکتا تھا۔ شہر میں اتنی منادی کرادینا کافی تھا کہ آئندہ لوگ پان کی پیک ذرا اونچی تھوکیں۔"

گوجرانوالہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم لوگوں کی اپنی تاریخ سے بے تعلقی اور بیدردی کی بات کس نزاکت سے کہی ہے مگر وار کیسا بھرپور ہے۔ "اس تنگ مگر بارونق بازار میں ہم ایک قدیم عمارت کے سامنے ٹھہر گئے۔ یہ سکھوں کی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل اور ناظم سردار ہری سنگھ نلوا کا مکان تھا، اب اس میں دینی مدرسہ کھل گیا ہے، پھر اس علاقے سے ذرا باہر جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دادا چرت سنگھ جاٹ کی سمادھی دیکھی۔ اس میں دینی مدرسہ کھل گیا ہے۔ سب سے شاندار سمادھی رنجیت سنگھ کے والد میاں سنگھ کی ہے، اس میں ابھی مدرسہ نہیں کھلا ہے...... دیکھنے میں نہایت دیدہ زیب مغل عمارت نظر آتی ہے، کہتے ہیں حسن ابدال سے لائی گئی تھی۔ اس زمانے میں مغل عمارتیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں، یہاں سے اٹھائی وہاں بنادی۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس پہلے والی لحد پر آسمان کو شبنم افشانی کرنے میں ذرا سہولت ہو جاتی تھی۔"

ساری کتاب پڑھ کر جس بات کا مجھے بڑا گہرا احساس ہوا وہ یہ کہ گاؤں بدل گئے، شہر بدل گئے، لباس اور انداز بدل گئے مگر ذہن وہیں اٹکا ہوا ہے۔ آزادی مل گئی، سوچ غلام کی غلام رہی۔ وہی نفرتیں، وہی ذات پات کے تفرقے، وہی رنگ و نسل کے فساد، وہی اوہام پرستی، وہی لوٹ کھسوٹ۔ اتنے بڑے برصغیر میں پشاور سے کلکتے تک جاتی ہوئی یہ شاہراہ افلاس، جبر اور جہالت کی تحریر ہے۔ توپیں جمع کی جارہی ہیں، ایٹم بم بنائے جارہے ہیں، کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر توپیں کس پر داغی جائیں گی اور یہ ایٹم بم کہاں گرائے جائیں گے، وہ کون سا ایسا سنگین جھگڑا ہے جو لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔ کوئی سبب، کوئی وجہ، کچھ تو ہونا چاہیے جس سے یہ جواز نکل سکے کہ اب ہم کو اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی لوگوں اور اپنی ہی تہذیب کو فنا کر دینا چاہیے۔ رضا علی عابدی نے اس کا بڑا موثر جواب دیا ہے:

"میرا پاکستان کا سفر ختم ہونے کو آیا۔ جی ٹی روڈ کے آخری سرے پر سفر کرتا ہوا میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحد تک پہنچا۔ شالامار باغ سے جلو موڑ تک جو بستیاں تھیں، ان کی دیواروں میں پچھلی جنگ کی گولیاں ابھی تک پیوست تھیں اور راہ میں جو کھیت اور میدان تھے ان

میں میری چشمِ تصور نے گرد کے بادل اڑاتے ہوئے ٹینک اور ان کے پیچھے رائفلیں اٹھائے، پیٹھ پر تھیلے باندھے اور سروں پر آہنی خود پہنے وہ فوجی دیکھے جن کے مقدر میں وقت کی شطرنج پر مہرے بن کر چلنے کے سوا کچھ نہیں۔"

جرنیلی سڑک کے کنارے بسنے والے ننگے بھوکے انسان اپنی تقدیر کے سیاسی وارثوں سے پوچھ رہے ہیں:

"یہ نفرت کب تک؟

یہ جنوں کہاں تک؟

شاید ان ناموں کا جواب بھی افلاک ہی سے آئے گا۔

یا شاید جیسے کہ قائم رضا کی نانی نے کہا تھا، جب "مولا آئیں گے۔ ہم لوگ انتظار میں ہیں کس وقت آئیں مولا۔"

(یہ تقریر جمعہ 30 جون 1989ء کو اردو مرکز کے زیر اہتمام رسم اجرا کے موقع پر کی گئی۔)

نئے زمانے کا سندباد

انتظار حسین

بی بی سی کے معروف براڈ کاسٹر رضا علی عابدی بارہا پاکستان کے شہروں اور دور دراز علاقوں میں گھومتے نظر آئے ہیں مگر اس بار وہ مختلف مہم پر ہیں اور سفر پر بھی اپنی تیسری کتاب "شیر دریا" بغل میں دبائے۔ انہوں نے اسلام آباد اور لاہور میں ہونے والی تقریبوں میں شاندار خراج تحسین وصول کیا ہے۔ لاہور کی تقریب کی صدارت پنجاب کے اطلاعات کے سیکرٹری جناب منوچہر نے کی۔ جناب الطاف گوہر مہمان خصوصی تھے اور مستنصر حسین تارڑ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے جو خود بھی سفر کے دھنی ہیں اور کئی مقبول سفرنامے لکھ چکے ہیں۔

اس تقریب میں سفرنامہ نگاری کی حیثیت سے رضا علی عابدی کو جو داد و تحسین ملی اس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ مجھے ان کا سفرنامہ "جرنیلی سڑک" پہلی بار پڑھنا آج تک یاد ہے۔ میں لندن میں تھا اور مانچسٹر کی بس میں سوار ہو رہا تھا، اسی وقت میں نے یہ کتاب خریدی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سفر کے دوران راستے کے سارے منظر دیکھوں مگر یہ کتاب عجب کام کر گئی۔ اس کے ورق

کھولتے ہی میں برصغیر کے شہروں میں کھو گیا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ میں مانچسٹر نہیں بلکہ سہسرام جاؤں اور اپنی عقیدت کا خراج شیر شاہ سوری کی نذر کروں۔ کتاب پڑھتے ہوئے یہ خواہش بھی ہوئی کہ جا کر اس شیر کو دیکھوں جس کے منہ سے تبت والوں کے عقیدے کے مطابق دریائے سندھ کے دھارے پھوٹتے ہیں۔ رضا علی عابدی اس جگہ نہ پہنچ سکے۔ سندباد ہوتا تو جیسے بھی بنتا شیر کے اُس دہن تک جا پہنچتا جس سے یہ دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نکلتا ہے۔

عابدی کی دلیل یہ تھی کہ یہ سب محض داستانیں ہیں، لہٰذا انہیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ سو جتن کر کے وہاں پہنچتے اور وہاں کچھ بھی نہ ہوتا تو مایوسی ہی ہوتی۔ حقیقت پسندی کے اسی احساس نے انہیں بیسویں صدی کا مسافر بنایا ہے۔ اس بیسویں صدی میں یہی ایک قباحت ہے کہ حقیقت نگاری پر کچھ زیادہ ہی مُصر ہے۔ اس نئے زمانے کے سفر میں جو بنیادی چیز لاپتا ہے، وہ "چوتھا کھونٹ" ہے جس سے ہماری داستانیں آراستہ ہوا کرتی تھیں۔

جو بات اس سفرنامے کو گزرے وقتوں کی مسافتوں سے بغلگیر کرتی ہے وہ مہم جوئی کا جذبہ ہے جو رضا علی عابدی کو آمادۂ سفر کرتا ہے۔ انہوں نے دریائے سندھ کے ایک سرے سے دوسرے تک سارا احوال دیانتداری سے بیان کیا ہے کیونکہ سفر کے دوران ان کی ایک آنکھ دریا کی لہروں پر اور دوسری دریا کے کنارے آباد بستیوں پر رہی ہے۔ ان آبادیوں کے باسی اور یہ دریا یوں نظر آتے ہیں جیسے جڑواں ہوں اور ایک دوسرے پر اپنی چھاپ لگا رہے ہیں......

وقت کی قلت کے باعث انہوں نے اختصار سے کام لیا ہے مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ لفاظی سے بچ گئے اور انہوں نے پورے دریا کو ایک کوزے میں بند کر دیا۔ انہوں نے دریا کے کنارے بسنے والوں کا حال جس سچائی سے بیان کیا ہے اُسے پڑھ کر ایک جیتی جاگتی داستان کا گمان ہوتا ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

روزنامہ ڈان۔ 29 اپریل 1994ء

نیا سفر.....نغمہ گر

انتظار حسین

(برصغیر کے کتب خانوں کی سیر، جرنیلی سڑک اور دریائے سندھ کے سفر اور ریل گاڑی

کی کہانی کو ریڈیو پروگرام اور پھر کتابوں کی شکل دینے کے بعد رضا علی عابدی کے تازہ سفر کا قصہ یوں ہے)

اس بار انہوں نے مقبول موسیقی کی دنیا کا طویل اور پر پیچ راستہ طے کیا ہے جو انیسویں صدی سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے خاتمے پر تمام ہوتا ہے۔ عابدی نے اس کہانی کا آغاز 1852ء سے کیا ہے۔ جب واجد علی شاہ کے لکھنؤ میں امانت کی "اندر سبھا" کھیلی گئی تھی لیکن تھیٹر یا ناٹک کی شروعات کلکتے سے ہوئی اور یہ بمبئی میں پھلا پھولا مگر ہمیں اندر سبھا میں جو معیار نظر آتا ہے وہ وہاں برقرار نہ رہ سکا۔ اس کے بعد اگرچہ تھیٹر کی مقبولیت برصغیر کے کونے کونے تک پہنچی لیکن اس کی شکل وصورت بگڑتی گئی۔ البتہ بیسویں صدی کے آغاز میں جب آغا حشر کاشمیری تھیٹر کی دنیا میں وارد ہوئے تو اسے اس کا معیار واپس ملا۔ بیسویں صدی اپنے ساتھ ایک نئی چیز لائی اور وہ تھا گراموفون ریکارڈ۔ ان ریکارڈوں کی تیاری میں شہر کلکتہ نے پہل کی۔ اس نو ایجاد توے میں کتنی ہی گلوکاراؤں کی آواز میں ٹھمری اور دادرے بھرے گئے مثلاً الہ باندی، امام باندی اور جانکی بائی چھپن چھری۔

عابدی بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کا ایک اور معجزہ سینما کی ایجاد تھا۔ 3 مئی 1913ء کو بمبئی کے کورونیشن سینما میں پہلی خاموش فلم راجہ ہریش چندر دکھائی گئی۔ اس کے تقریباً بیس برس بعد ہندوستان کی پہلی بولنے والی فلم عالم آرا بمبئی کے مجسٹک سینما میں پیش کی گئی۔

عابدی کی رائے ہے کہ فلم ساز ادارے نیو تھیٹرز میں کے ایل سہگل کا نمودار ہونا ایک بڑا واقعہ تھا۔ ان کی رائے میں اُتنا ہی اہم واقعہ آرزو لکھنوی کا کلکتہ میں وارد ہونا تھا جنہیں وہ بابائے نغمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تیسرا بڑا واقعہ اردو فلموں میں کانن دیوی کا داخل ہونا تھا۔

برصغیر میں فلم سازی کا کیسا شاندار آغاز تھا اور عابدی نے اس دلفریب فن کی داستان اپنے دلکش انداز میں بیان کی ہے۔ اپنے قصے کا خاتمہ انہوں نے اپنے دور کے دو بہترین نغمہ نگاروں، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری کے ذکر پر کیا ہے جنہوں نے عابدی کے بقول فلمی گانوں کو شاعری کی بلندی تک پہنچا دیا۔

اپنے پیش لفظ میں رضا علی عابدی نے جو سوال اٹھایا ہے اس کا سارے معاملے سے گہرا تعلق ہے۔ نغمہ نگاروں نے علم و ادب میں جو حصہ ڈالا ہے، علم و ادب کی دنیا اس کا اعتراف کرنے میں کیوں ناکام رہی۔ وہ حیران ہیں کہ کسی یونیورسٹی نے کسی محقق سے اس ایک صدی

پرانی شاعری اور اس کے تخلیق کاروں پر تحقیق کرانے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ اس کے بجائے انہوں نے ان شاعروں کی طرف سے بے توجہی برتنے کا رویہ اختیار کیا۔ عابدی نے قتیل شفائی کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ یہ شاعر حضرات خود کو علمی شاعر قرار دیتے ہیں اور مجھے فلمی شاعر کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ (ترجمہ)

روزنامہ ڈان۔ 10 ستمبر 2010ء

جرنیلی سڑک..... تہذیبی زوال کا نوحہ

منیر احمد شیخ

پرانے وقتوں میں سیاح جب گھروں سے نکل کر ملک ملک کی خاک چھانتے تھے تو ان کی دشت نوردیوں کے پس پردہ دراصل ہوسِ سیر و تماشا ہوتی تھی جو انہیں عمر بھر جگہ جگہ لیے پھرتی تھی۔ یہ ساری زمین ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی، نہ پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہ فارن ایکسچینج کے چکر، نہ ہیلتھ سرٹیفیکیٹس، بس ایک عصا ہاتھ میں لیا اور گٹھڑی کندھے پہ ڈالی اور کائنات اور اس کی بوالعجبیوں کے دیکھنے کو گھر سے نکل پڑے اور پھر برسوں تک واپس نہ لوٹے۔ جہاں ٹھہرے وہاں کی بود و باش کو دیکھا، پسند آئی تو کچھ دیر کے لیے وہیں کے ہو رہے۔ معاشرت میں یوں گھل مل گئے کہ وہاں شادیاں بھی کر لیں۔ پھر جب طبیعت سیر ہوگئی تو وہاں سے پھر خالی ہاتھ کوچ کیا اور کسی اگلی منزل کو اپنا مستقر بنایا۔ ہمارے ہاں ابن بطوطہ اور بہت سے سیاح اسی انداز میں آئے مگر ان سب میں ایک بات جو مشترک تھی، وہ یہ تھی کہ سیر و سفر کی لذت کو انہوں نے اپنی ذات تک محدود نہ رکھا بلکہ اپنے ساتھ دنیا کو بھی شریک کیا۔ جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے ایسے دلچسپ پیرائے میں قلم بند کیا کہ رہتی دنیا تک اپنے عہد کو زندہ کر گئے اور اسی کے ساتھ خود بھی لافانی ہو گئے۔ قدیم زمانوں اور وقتوں کو سیاح جس طرح مقید کرتا ہے، اس کا طریق کار تاریخ دان اور روزنامچہ نویس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو صرف مشاہدے تک محدود نہیں رکھتا، وہ ان میں اپنی محسوسات کو بھی شامل کر دیتا ہے اور یوں وہ تجربہ ایک سطحی تجربے سے نکل کر انسانی جذبات کی گہرائیوں کا آئینہ بن جاتا ہے جس میں آپ اس عہد کے ساتھ ساتھ اس میں بسر

ہونے والی زندگی کے مختلف روپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

رضا علی عابدی اس دور کا سیاح ہے جس کا سفر ایک منصوبہ بندی کے تحت اختیار کیا گیا۔ یہ منصوبہ بندی بی بی سی نے کی اور اس کو عملی شکل دینے کا چیلنج رضا علی عابدی نے قبول کیا۔ قدیمی عہد کے سیاحوں کے برعکس عابدی کے پاس اس سفر میں آنے والے کرداروں کی گفتگو کو محفوظ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بھی تھے، سفر کے نقشے بھی تھے، ریل گاڑی، بس اور ہوائی جہاز کی سہولت کے ساتھ سفر کا رخ اور منزلیں بھی متعین تھیں۔ اسے بس ایک لمبی لکیر کے اوپر ہی چلنا تھا، یہ لکیر ہمارے برصغیر میں عہد مغلیہ سے ذرا پہلے شیر شاہ سوری نے کھینچی تھی جو تاریخ میں شاہراہ شیر شاہ کے نام سے جانی گئی۔ یہ لکیر یا شاہراہ اعظم اس دور کا ایک بہت عظیم کارنامہ تھا۔ اتنا ہی بڑا کارنامہ جتنا اس دور میں ریل گاڑی، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن ہیں۔ یہ سب مواصلات کے ذرائع ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شیر شاہ سوری نے وسائل کی کمی کے زمانے میں یہ سڑک بنا کے ایک بڑا تہذیبی کارنامہ سرانجام دیا کہ اس سڑک کے وجود میں آنے سے اس برصغیر میں بسنے والی اقوام نہ صرف ایک دوسرے کے قریب آگئیں اور ایک دوسرے کی ثقافت سے روشناس ہوئیں بلکہ اس شاہراہ کی تعمیر سے پورے برصغیر کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا جس نے یہاں کے بسنے والوں کی معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کے خطوط بدل کے رکھ دیے۔ دیکھتے دیکھتے یہ شاہراہ محض ایک گزرگاہ نہ رہی بلکہ ایک زبردست تہذیبی دھارے میں بدل گئی اور اسی گزرگاہ پر سے تاریخ کے قافلے پورے ساز و سامان سے لیس ہو کے گزرنے لگے۔ گویا اس برصغیر کی تاریخ کو دیکھنا ہو تو بس اس گزرگاہ پر سے گزرنے والوں اور اس کے کنارے آباد ہونے والے شہروں اور بستیوں کو دیکھ لو۔

بی بی سی والوں نے جرنیلی سڑک کی داستان کا جب منصوبہ بنایا ہو گا تو ان کی نظر انتخاب جرنیلی سڑک پر اسی لیے پڑی کہ اس شاہراہ پر انھوں نے تہذیبوں کو بنتے سنورتے اور پھر اجڑتے دیکھا، لہٰذا ان بستیوں کا سب سے بڑا حوالہ یہی شاہراہ ہی بنتا ہے اور اسی حوالے سے ان تہذیبوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

آج کے ذرائع ابلاغ میں ریڈیو ایک ایسا طاقتور ذریعہ ہے کہ اس کے راستے میں آپ لاکھوں کروڑوں تک ایک لمحے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اس ذریعے سے ہوا کی لہروں پر سوار ہو کر روزانہ لاکھوں کروڑوں الفاظ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بی بی سی نے ان الفاظ کو ہوا کی لہروں

کے سپرد کرنے کے ساتھ انہیں محفوظ کر لینے کا منصوبہ بنا کر نہ صرف بہت سے قیمتی سرمائے کو ضائع ہونے سے بچا لیا بلکہ براڈ کاسٹنگ کی تاریخ میں اس عمل سے ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ اس روایت کا سہرا یقیناً بی بی سی کے سر ہے کہ اس نے اپنے یہاں سے براڈ کاسٹ ہونے والے تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے پروگراموں کو کتابوں میں محفوظ کر کے علم کی دنیا میں اضافے کے ساتھ ساتھ براڈ کاسٹنگ کے معیار کو بھی بلندی عطا کی۔

اس برصغیر ہی پر انہوں نے اس سے پہلے "اسٹوری آف دی راج" نامی کتاب میں انگریزی تسلط کے زمانے پر ریٹائرڈ آئی سی ایس انگریز افسروں کے انٹرویوز پر مشتمل واقعات کے ذریعے انگریزی سامراج کی تصاویر کو محفوظ کر لیا۔ ہم بی بی سی کو بہت گالیاں دیتے رہتے ہیں مگر اس کے ان کارناموں کا اعتراف نہ کرنا بھی اندھاپن ہوگا جسے ذہنی تعصب بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں شاید یہ حسرت ہی رہے کہ ریڈیو پاکستان کو بھی خدا کبھی یہ توفیق دے کہ وہ بھی اپنے یہاں تہذیبی و ثقافتی نوعیت کے پروگرامز کو تشکیل دے اور پھر انہیں محفوظ کرنے کی منصوبہ بندی کرے۔

رضا علی عابدی کی "جرنیلی سڑک" ہمارے ماضی اور حال کا ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ اس نے خود لکھا ہے کہ "کبھی کبھی اس پر تاریخ کی داستانوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کی داستان نہیں۔ یہ کتاب حالیہ دہائیوں میں آنے والے غیر معمولی سماجی تغیر کا مشاہدہ ہے۔" اس کو لکھتے وقت مصنف نے انٹرویوز اور تبصرے کے امتزاج سے اس سڑک کے کنارے آباد شہروں کا احوال اور ان میں رہنے والے لوگوں سے گفتگو کی ہے۔ شہروں کے احوال میں ان کے ماضی کے حوالے ہیں اور گفتگو میں زمانۂ حال کا تذکرہ ہے۔ جس میں بالخصوص حال کو ماضی کے مقابلے میں دیکھنے کی کوشش کارفرما ہے۔ شہروں کے احوال اور لوگوں کی گفتگو سے چھوٹے چھوٹے تہذیبی امیجز ابھرتے جاتے ہیں اور تصویروں کی صورت میں آپ انہیں دیکھتے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی تصویریں مجھے ان ٹین کے ڈبوں کی یاد دلاتی ہیں جن میں محدب شیشے فٹ کر کے ہاتھ سے گھومنے والی ایک چابی کی مدد سے گلیوں میں بچوں کو تصویریں دکھائی جاتی تھیں۔ ایک مٹھی بھر آٹا دے کر ہم بچپن میں اس ڈبے میں دنیا بھر کی سیر کیا کرتے تھے۔ اس میں ہم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ "بارہ من کی دھوبن" اور کلکتہ شہر دیکھا اور ہمارے اندر تماشۂ دنیا کا شوق پیدا ہوا۔ رضا علی عابدی نے بھی شہروں کو بچے کی سی معصوم آنکھ سے دیکھا ہے جس میں حیرت اور تجسس دونوں ہوتے ہیں۔ وہ اس سڑک پر سیاحوں کی طرح گھوما، صحافیوں کی طرح اس کے گرد بسنے والوں کا مشاہدہ کیا اور ادیب کے

حساس جذبات کے ساتھ انسانی دکھوں اور مسرتوں کو محسوس کیا۔ یہ لفظوں کا ایک بائسکوپ ہے جسے دیکھ کر آپ اس میں کھو جاتے ہیں اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ یہ فلم یونہی چلتی رہے اور کبھی ختم نہ ہو۔

''جرنیلی سڑک'' کے سفر کی اس داستان میں قاری کو بہت سی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ پہلی بات تو یہی کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان اور ہندوستان صرف دو الگ سیاسی اکائیاں ہی نہیں، وقت گزرنے کے ساتھ اب دو الگ الگ تہذیبی شخصیتیں بھی بن چکی ہیں جنہیں آپ ان کے الگ الگ تہذیبی خطوط سے پہچان سکتے ہیں۔ مصنف جب پاکستان کا سفر ختم کر کے واہگہ کی سرحد پار کر کے ہندوستان میں قدم رکھتا ہے تو وہ لکھتا ہے: ''میرا پاکستان کا سفر تمام ہوا۔ چند لمحوں کی اڑان مجھے ہندوستان لے آئی۔ لوگ کہتے ہیں، ایک ہی سرزمین تو ہے بیچ میں صرف سیاسی بٹوارہ ہے۔ پہلے کبھی ہوگا اب نہیں ہے۔ اب معیشت الگ ہے، معاشرت جدا ہے، لہجے الگ ہیں، پہناوے جدا ہیں، روپ الگ ہیں، رنگ جدا ہیں۔''

پاکستان کے تہذیبی تشخص میں ابھرنے والی شے مالی خوشحالی ہے۔ وہ جس شہر میں جاتا ہے اور اس شہر کے کسی ایسے بوڑھے سے سوال کرتا ہے کہ اتنے برس اس شہر میں گزارنے کے بعد اب وہ کیا محسوس کرتا ہے تو اس کا جواب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ''اب پیسے کی بہتات ہے مگر زندگی میں اب سکون نہیں رہا۔ پہلے وقت اچھا تھا۔'' پاکستان میں جرنیلی سڑک پر سفر کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مادی خوشحالی تو تقسیم کے بعد ہم نے حاصل کر لی مگر تہذیبی اعتبار سے ہماری زندگی پہلے کی نسبت زیادہ بے رنگ، کھوکھلی، منافقانہ اور محدود ہوگئی۔ ہمارے دعوؤں کے باوجود کہ ہم تاریخ کے وارث ہیں، ہماری عملی زندگی تاریخی شعور سے عاری ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی ایک مثال تو جرنیلی سڑک کا نام ہی ہے۔ شیر شاہ سوری کی اس سڑک کو پاکستان میں جی ٹی روڈ کہا جاتا ہے جبکہ ہندوستان میں یہ شیر شاہ سوری کے نام پر ہی ''شیر شاہ سوری مارگ'' کہلاتی ہے۔ ''مارگ'' سنسکرت میں راستے کو کہتے ہیں۔ بی بی سی کا ہمارا یہ سیاح جرنیلی سڑک کے کنارے آباد بیشتر قلعوں کو تنہا، اداس اور ویران پاتا ہے۔ جن میں سے اکثر میں فوج براجمان ہے یا قیدی رہتے ہیں اور عوام پر ان کے دروازے بند ہیں۔ پشاور کا قلعہ بالا حصار جس کا بیشتر حصہ فوج کے حوالے ہے، اٹک کے قلعے پر بھی فوج قابض ہے، رہتاس کا قلعہ ویسے ہی اجڑ چکا ہے، لاہور کے قلعے کا بھی ایک حصہ قید خانے میں بدل دیا گیا تھا۔ ہماری تاریخ کے یہ نشان ہمارے لیے مردہ ہو چکے ہیں اور صرف پتھر کے ڈھیر ہیں۔ ان کے اندر پنہاں جلال و جمال کے سارے روپ ہمارے لیے بے معنی ہو چکے

ہیں۔ رضا علی عابدی "رہتاس تنہا کھڑا ہے" کے عنوان کے تحت ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ "یہ قلعہ جرنیلی سڑک سے صرف چار پانچ کلومیٹر دور ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہے مگر چپ سادھے۔ عظمتِ رفتہ کے اس شاہکار کو اب کوئی دیکھنے بھی نہیں آتا۔ ایک پٹھان بادشاہ نے اس خطۂ زمین پر جو فصیلیں اٹھائی تھیں، وہ اپنی قدامت کے باعث نہیں بلکہ دوسروں کی بے توجہی کے سبب یوں جھکی جا رہی ہیں کہ اب گریں اور اب گریں۔" عابدی کا کہنا ہے کہ دراصل ایک گزرگاہ ہی تہذیب کو زندہ رکھنے کی ضامن ہوتی ہے اور جو بستیاں اور شہر راہگزر سے دور ہو گئے، وہ آہستہ آہستہ خود ہی مر گئے۔ مصنف کا یہ مشاہدہ ہمیں تاریخی حقیقتوں کی سنگدلی سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہم سنتے آئے ہیں کہ بستیوں کے مقدر دریاؤں سے جڑے ہوتے ہیں، دریا اپنا کنارہ چھوڑ کر دور چلے جائیں تو آبادیاں ویرانوں میں بدل جایا کرتی ہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عظمتوں کی نشانیوں کے مقدر سڑکوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ سڑکیں اپنی راہ بدل جائیں تو یہ نشانیاں راہ میں ماری جاتی ہیں۔" ..... "اب جدھر سے سڑک گزرتی ہے ادھر سے خلق خدا گزرتی ہے اور رہتاس اداس کھڑا ہے۔"

یہ داستان ایک سڑک کی داستان نہیں، یہ ہمارے تہذیبی عروج و زوال کا سفر ہے۔ مصنف نے سڑک کے اختتام پر پہنچ کر یہی محسوس کیا کہ ہم مادہ پرستی کی راہ اپنا کر اپنے تہذیبی سرمائے سے بالکل بے نیاز اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ہم زندگی کی ان خوشیوں سے محروم ہو چکے ہیں جو بقا کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ سڑک ختم ہو گئی اور ہمارا سیاح اس کے آخری کنارے پر کھڑا سوچ رہا ہے:

"پاکستان میں دولت برس رہی تھی۔ معاشیات سے لے کر منشیات تک مختلف وسیلوں سے امارت چلی آئی تھی۔"

"ہندوستان میں دولت اُبل رہی تھی..... مگر اس ظاہری خوشحالی سے زندگی میں کیا داخل ہوا اور زندگی سے کیا نکل گیا، اس کا میزانیہ بناتے ہوئے جی گھبراتا ہے۔"

"جو چلا گیا وہ سکون ہے، جو داخل ہوا وہ اضطراب ہے۔ اضطراب کا یہ حال کہ جیسے صبر کا یارا جاتا رہا۔ جیسے اچھے دنوں کے انتظار کی سکت جاتی رہی..... پیسہ، کار، رنگین ٹیلی ویژن، ویڈیو، اے سی جو کچھ آتا ہے راتوں رات آ جائے۔ اگلی صبح نمودار ہو تو گھر آنگن غیر ملکی چیزوں سے بھرے نظر آئیں۔"

"پیروں فقیروں کے مزاروں پر خوب رونق ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم چڑھاوے چڑھا رہے ہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی داستانوں سے مایوس ہو کر لوگ کب کے سوئے ہوؤں کے آستانوں پر جا پہنچے ہیں۔"

اور یوں یہ داستان ایک اداس نوٹ پر ختم ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سڑک کے کنارے جن جن بستیوں کی تصویروں کو اس نے دیکھا، وہ تصویریں نہیں تھیں، وہ تو ایک نوحہ تھا جو ہمارے تہذیبی زوال پہ لکھا گیا یا شہر آشوب تھا جس کے اندر ہم نے اپنی پستیوں کی اتھاہ گہرائیاں دیکھیں۔ ہمارے سیاح نے جو دیکھا، ہمیں نہایت ایمانداری کے ساتھ دکھا دیا۔ یہ سفر اختیار کر کے وہ خود بھی اداس ہو گیا اور ہمیں بھی اداس کر گیا۔

اسلام آباد۔ 26 ستمبر۔ 1989ء۔

جرنیلی سڑک کی تخلیقی شان

جمیل جالبی

شیر شاہ سوری نے صرف چند سال حکومت کی..... ان تھوڑے سے برسوں میں جذبۂ خدمت سے سرشار اس حکمراں نے ایسی بنیادی تبدیلیاں کیں کہ آج ہم اس کا نام ایک جری، انصاف پسند، عوام دوست بادشاہ کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ اس بادشاہ نے اپنی وسیع سلطنت کو ملانے کے لیے ایک ایسی سڑک بنائی جو آج بھی عوام و خواص میں اسی کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ رضا علی عابدی نے اسی سڑک کے حوالے سے بی بی سی سے ایک پروگرام پیش کیا جسے ساری دنیا میں پسند کیا گیا اور اب یہی تحریریں کتابی صورت میں "جرنیلی سڑک" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

عام طور پر ریڈیو پروگرام سننے کے بعد جب ان تحریروں کو مطبوعہ صورت میں پڑھتے ہیں تو ان میں وہ دلچسپی محسوس نہیں ہوتی جو اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب انہیں سنا گیا لیکن عابدی کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ یہ کتابی صورت میں پڑھتے وقت بھی دلچسپ اور پر اثر محسوس ہوتی ہے۔

بعض کتابیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ آپ انہیں روانی کے ساتھ پڑھ بھی جاتے ہیں لیکن

جب کتاب بند کر کے جائزہ لیتے ہیں کہ کتاب پڑھ کر کیا پایا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ کچھ کھویا نہ کچھ پایا البتہ وقت آسانی سے گزر گیا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آپ کا وقت بھی آسانی سے گزر جاتا ہے اور جب آپ کتاب ختم کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تپتی دوپہر میں پوری تہذیب کے شجر سایہ دار نے آپ کو ٹھنڈک اور سایہ مہیا کیا ہے۔ اس کتاب میں ایسی تخلیقی شان ہے کہ رضا علی عابدی کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ماضی اور حال بیک وقت آپ کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور تبدیلی کا عمل بھی آپ کو شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ منظر کیسے بدل رہے ہیں، انسان کیسے بدل رہے ہیں، ان کے سوچنے کے انداز کیسے بدل رہے ہیں، وہ پہلے کیا تھے، اب کیا ہو گئے ہیں۔ بدلتے معاشرے کی یہ واضح تصویریں بھی سامنے آ جاتی ہیں، پشاور سے کلکتہ تک کے سفر میں ماضی حال سے اور حال ماضی سے بغلگیر ہوتا ہے اور جرنیلی سڑک اس سفر کو ایک وحدت عطا کرتی ہے......

رضا علی عابدی کی اس کتاب نے میرے سامنے سوچنے اور غور کرنے کے بہت سے دریچے کھول دیئے ہیں اور وہ بھی دلچسپ اور پرلطف انداز سے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اسلام آباد۔ 26 ستمبر 1989ء

جب انشاء پردازی مصوری اور شاعری بن جاتی ہے

محمود ہاشمی

رضا علی عابدی نے کارنامہ انجام دیا ہے۔

میں اسے کارنامہ اس لیے کہتا ہوں کہ اپنی کتاب "جرنیلی سڑک" میں جس طرح انہوں نے ہمیں ہندو پاک کی سیر کرائی ہے، بڑے بڑے شہروں کا جغرافیہ بیان کیا ہے، ماضی کی گرد میں لپٹے ہوئے اوراق کو کھولا ہے اور پھر بڑی شگفتہ بیانی سے مزے لے لے کر ہمیں ساڑھے چار سو سال پر محیط سیاست، سماج، تہذیب و تمدن، روحانیات، رومان، موسیقی، ادب اور شعر و شاعری کی جھلکیاں دکھائی ہیں، وہ ایک کارنامہ ہی ہے اور یہ اس لیے بھی ایک کارنامہ ہے کہ ہوائی جہازوں، ریل گاڑیوں اور تیز رفتار بسوں کے اس دور میں بھی صرف ایک مہینے میں پندرہ سو میل میں پھیلے

ہوئے ہر شہر کے ہر پہلو کا مشاہدہ کرنا، اس میں بسنے والے ہر خاص و عام تک پہنچنا اور طبیعت کی تازگی کو بھی بہر حال برقرار رکھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں......

عابدی صاحب کی "جرنیلی سڑک" بڑی آباد ہے۔ اس میں شہر ہیں اور شہروں سے زیادہ ان میں بسنے والے ہیں۔ ان سب کا ذکر وہ بڑے جوش و جذبہ اور بڑی محبت اور خلوص سے کرتے ہیں۔ شہروں اور انسانوں، دونوں کے بیان میں عابدی صاحب کا قلم قدم قدم پر موتی بکھیرتا ہے اور اس نفاست سے بکھیرتا ہے کہ انشاء پردازی، مصوری اور شاعری بن جاتی ہے۔

یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے جن کو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھا جا سکتا ہے، بار بار پڑھا جا سکتا ہے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے یا برصغیر کی تاریخ سمجھ میں آتی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس میں ایسے ایسے خوبصورت جملے ہیں جو شعروں کی طرح مزہ دیتے ہیں اور اس کثرت سے ہیں کہ جب جی چاہے، کتاب کھول لیں اور جو صفحہ سامنے آ جائے، اس پر بکھرے ہوئے شہ پاروں سے دل بہلا لیں۔

"جرنیلی سڑک" بڑے کام کی چیز ہے۔

لندن۔ 30 جون 1989ء

کتب خانہ.....ایک پرزور اپیل کی تمہید

پروفیسر رالف رسل

جب بی بی سی کے ڈیوڈ پیج صاحب نے مجھ سے اس کتاب کے لیے پیش لفظ لکھنے کو کہا تو میں لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا "اردو میں میرے کام کی نوعیت ایسی نہیں رہی کہ لائبریریوں کی چھان بیان کی ضرورت پڑتی۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کام کے لیے موزوں آدمی ہوں۔" کہنے لگے "آپ فوراً انکار نہ کیجیے۔ مجھ سے اور رضا علی عابدی صاحب سے آ کے ملیے تاکہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہو۔" میں گیا، گفتگو کی اور آخر طے ہوا کہ میں مسودہ پڑھوں گا اور پڑھنے کے بعد اگر معلوم ہوا کہ کچھ لکھ سکتا ہوں تو لکھوں گا۔

جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ ایک ہی نشست میں مکمل کرنے کو جی چاہا۔ افسوس! مجھے اتنی فرصت نہیں تھی لیکن فہرست میں مضامین کا خلاصہ دیکھ

کہ میں نے طے کیا کہ پہلے سات اور آخری پانچ باب ضرور پڑھوں گا اور ان کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔

جیسے جیسے میں پڑھتا گیا، میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ خاص طور پر کتاب کا وہ حصہ جس میں کلیات غواصی کی دریافت کا بیان ہے اور وہ پورا باب جس میں رضا صاحب نے "بیاضِ غالب بخطِ غالب" کا سارا قصہ لکھا ہے۔ کسی جاسوسی ناول سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ (یہ ضمنی بات ہے، لیکن لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رضا صاحب کی زبان اور طرزِ بیان دونوں اتنے اچھے ہیں کہ پڑھ کے طبیعت خوش ہوگئی۔ نہ انگریزی الفاظ کا بلاضرورت استعمال اور نہ ثقیل اردو الفاظ سے رعب جمانے کی کوشش۔ سلیس اور رواں اردو میں اپنی بات کہے جاتے ہیں اور پڑھنے والے کو لطف آتا ہے۔)

ایک طرح سے پوری کتاب ایک پرزور اپیل کی تمہید ہے۔ رضا صاحب نے افراد، انجمنوں اور اربابِ حل وعقد، سب کی توجہ اس بات کی طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں، پبلک اور ذاتی کتب خانوں میں اور مدرسوں، خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہا کتابوں اور مخطوطوں کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول ان کے "اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آ جائے۔" اور اگر اس کا تحفظ نہ کیا گیا اور بہت جلد نہ کیا گیا تو اس کا ایک بڑا حصہ تباہ ہو جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ہر وہ آدمی جس کے دل میں اس ورثے کی قدر ہے، رضا صاحب کا شکر گزار ہوگا اور ان کی اپیل کی پوری پوری حمایت کرے۔

لندن۔ 4 فروری 1985ء

(کتاب میں شامل کرتے ہوئے اس تحریر کی کچھ سطریں حذف کر دی گئی تھیں۔ یہاں پیش لفظ کا مکمل متن نقل کیا گیا ہے۔ ر۔ع)

کتب خانہ...... موضوع کا حق ادا کر دیا

صالحہ عابد حسین

عزیز رضا عابدی! دعائیں

میری بھتیجی سیدہ سیدین کے ہاں ایک نہایت خوبصورت جلد سے مزین اعلیٰ درجہ کی کتابت، عمدہ کاغذ پر چھپی ایک کتاب میز پر رکھی دیکھی۔ تو جیسے اس نے کھینچ لی، اٹھائی۔ مصنف کا نام رضا علی عابدی، موضوع ہندو پاک کے کتب خانہ۔ کتاب اٹھا لائی اور مصروفیت، گرمی، بیماری کے باوجود تین دن میں پڑھ ڈالی اور اسی وقت یہ خط اس حسین، مفید، شاندار کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دینے کے لیے لکھ رہی ہوں۔

یہ کتاب اگر ایک طرف ہندوستان اور پاکستان کے مشہور و معروف کتب خانوں سے تفصیلی تعارف کراتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ اُن گمنام، بدحال کتابوں کے بے بہا ذخیروں سے واقف کراتی ہے جس میں بے مثال کتابوں کے جواہر بے بہا اور دریائے بیش بہا پوشیدہ ہیں۔ علم و ادب، مذہب اور تصوف اور دنیا بھر کے علوم کے خزانے خاک میں رُل رہے ہیں یا ان کی طرف توجہ نہ کی گئی تو کچھ عرصے میں ختم ہو جائیں گے۔ جب آپ شاید دو سال پہلے مجھ سے ملنے آئے تھے تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ آپ عظیم کام کا بیڑا اٹھا کر آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا مشکل اور ایسا کٹھن کام تھا جو علم و ادب سے پوری طرح واقف ایک ٹیم کے لیے بھی مشکل تھا مگر آپ نے تنہا اس بار عظیم کو اٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔ اب یہ صاحبانِ دل اور صاحبانِ عزم کا کام ہے کہ علم و ادب کے ان بے بہا خزانوں کو کسی طرح تباہ ہونے سے بچائیں۔ اپنے ملکوں میں صاحبانِ علم اور قدرداں حضرات نایاب نہیں مگر ان تک پہنچنا کس طرح ممکن ہو۔ اربابِ سیاست و اقتدار کو اس کی فرصت کہاں ہے، ذوق کہاں ہے؟ بہر حال آپ نے بڑا کام کیا ہے اور اس کی ایک بار پھر دلی مبارکباد دیتی ہوں۔

بظاہر اس ''کتب خانہ'' کے خشک نام سے لوگوں کو وہ کشش نہیں ہو سکتی جو اس کا حق ہے۔ وہ کیا جانیں کہ اس خشک نام میں کیسے گل ہائے تر، بہرگ سبز اور لولوئے شاہوار اور گوہر آبدار پوشیدہ ہیں۔ آپ نے نہ صرف معلومات حاصل کر کے جمع کی ہیں بلکہ کتاب کو اس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ ہاتھ میں لے کر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ عنوانات ہی ذہن کو کھینچ لیتے ہیں۔ علم کی وادی، عبادت جاری ہے، بے خبری کا سلسلہ، چھ ہزار سنگِ میل، دروازۂ خاور بند ہے وغیرہ۔ ان عنوانات کی داد دینا مشکل ہے نہ کہ نفسِ مضمون کی۔

خاکسار صالحہ عابد حسین جامعہ نگر۔ نئی دہلی 25۔9 ستمبر 1985ء

نادر ادبی کارنامہ

شان الحق حقی

مشفق گرامی، تسلیم

آپ کا عزیز تحفہ اور عظیم کارنامہ ''جرنیلی سڑک'' ملا۔ نہایت ممنون ہوں۔ دل خوش ہو گیا۔ یاد نہیں کہ حال میں بلکہ مدت سے کوئی کتاب اتنے شوق سے، اتنا لطف لے کر پڑھی ہو۔ لطف کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پایا کہ واقعی آپ کے ساتھ ساتھ جرنیلی سڑک بلکہ تاریخ کے گزشتہ ادوار کی سیر ہوگئی۔ آپ کا گہرا مشاہدہ، موضوع سے گہری دلچسپی، تاریخ سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ عصری احوال سے پوری وابستگی، آثار و باقیاتِ پارینہ کے علاوہ حالات اور جیتے جاگتے کرداروں سے مخلصانہ ارتباط، ان کے دلچسپ اور نکتہ خیز مکالمے، غرض کیا کچھ نہیں۔ پھر آپ کا شگفتہ اندازِ بیاں، سادہ و شائستہ رواں دواں، پُر اثر، گویا ادب کی جان۔ اتنی باتیں کسی تصنیف یا تالیف میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔ یہ بات کسی ڈرائنگ روم کے مکالمے یا اسٹڈی میں لکھی ہوئی تحریر میں کہاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ یہ بلاشبہ ایک نادر ادبی کارنامہ ہے جس کی ادبی حیثیت دستاویزی حیثیت سے کم نہیں ہے۔ (سبحان اللہ)

مخلص شان الحق حقی۔ کراچی

24 جولائی 1993ء

''جانے پہچانے'' تحریر نہیں، گفتگو ہے

آصف نورانی

مرزا غالب نے جن کے حوالے رضا علی عابدی بار بار دیتے ہیں، خطوط کو مکالمہ بنا دیا تھا۔ گفتگو کا غالب کا یہ انداز کانوں کو بھلا لگتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر رضا علی عابدی نے بھی اپنا ایک مقام بنا لیا ہے ورنہ تو یوں ہے کہ تمام معروف براڈکاسٹر مائیکروفون پر تقی نثر پیش کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عابدی کی تقریر میں سارا زور اندازِ بیان پر ہوتا ہے، نفسِ مضمون پر نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ تقریر کرنے والا ساڑھے سات منٹ سے تجاوز کر

جائے تو گویا اپنی حد کو پار کر رہا ہے لیکن خود عابدی کی تقریریں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ وہ اپنی مقرر کی ہوئی حد سے دُگنا وقت لے لیں، تب بھی سننے والے بیزار نہیں ہوتے۔

اگرچہ انہوں نے "کتب خانہ"، "جرنیلی سڑک"، "شیر دریا" اور "ریل کہانی" جیسی کتابیں لکھی ہیں اور بچوں کے لیے جیسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے، وہ بھی تحریر کی ہیں مگر ان کی جس چیز کو آنے والے وقتوں کے لیے بھی بچا کر رکھا جانا چاہیے وہ ان کی مختلف تقریریں ہیں جو انہوں نے برطانیہ، پاکستان، بھارت اور ماریشس میں کی ہیں۔ ان کے موضوعات میں ادبی اور کچھ غیر ادبی شخصیات، اردو زبان اور انیس و دبیر کے موازنے جیسے عنوان شامل ہیں۔ ان کی کتاب "جانے پہچانے" کی ابتداء دور حاضر کے اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے متعلق ان کی تقریروں سے ہوتی ہے۔ اس میں انہوں نے پتے کی بات کہی ہے کہ یوسفی صاحب کا مزاح بے ضرر ہے، وہ مزاح لکھتے ہیں، کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔ یہی خوبی خود عابدی میں بھی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا سامع یا قاری مسکرائے مگر کسی کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ اس رویے کو اخلاص کا نام دیتے ہیں اور اگر اس کا ثبوت درکار ہے تو ان کا لکھا ہوا افتخار عارف کا خاکہ ہے۔ جس میں اگرچہ افتخار کی کمزوریوں کا بیان بھی ہے مگر یوں کہ وہ کمزوریاں ان کی خوبیاں محسوس ہونے لگتی ہیں۔

وہ گوپی چند نارنگ کو اردو کا سب سے عمدہ نقاد سمجھتے ہیں اور یہ معاملہ اعتبار کا ہے، اعتقاد کا نہیں۔ ممتاز مفتی کے بارے میں کہتے ہیں کہ دوسروں کے قلم لکھتے ہیں، ان کا قلم گفتگو کرتا ہے۔ استاد بسم اللہ خاں اور ساقی فاروقی کے متعلق عابدی کی تحریر پڑھنے کی چیز ہے۔

"جانے پہچانے" کی بات کرتے ہوئے یہ رائے دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے جو براڈکاسٹنگ کو اپنا ذریعۂ روزگار بنانا چاہتے ہیں یا جو جدید اردو ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ (ترجمہ)

روزنامہ ڈان۔ کراچی

سید ہاشم رضا:

"کتب خانہ" ایسی کتاب ہے جو رضا علی عابدی کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

کراچی۔ 20 مئی 1985ء

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی:

"کتب خانہ" اردو ادب میں حسنِ صورت اور حسنِ سیرت، دونوں اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ بی بی سی کی نشریات ایک زمانہ سنتا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نفسِ مضمون کی دلچسپی اپنی جگہ لیکن رضا علی عابدی کی آواز اور ان کی تقریر کے انداز کا سحر سننے والے پر طاری ہو جاتا ہے۔ "کتب خانہ" بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ یہ مصنف کا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اتنے دلکش انداز میں کتب خانوں کی بات کی ہے۔

کراچی۔ 20 مئی 1985ء

نصر اللہ خاں:

رضا علی عابدی بات کو پہلے تولتے ہیں، پھر بولتے ہیں۔ وہ بی بی سی میں ملازمت سے پہلے بھی سچ بولتے تھے، اب بھی بولتے ہیں۔ وہ جھوٹ کے پلندے سے سچ نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ "کتب خانہ" لکھتے ہوئے بھی انہوں نے کہیں ڈنڈی نہیں ماری۔

کراچی۔ 20 مئی 1985ء

رضا علی عابدی کی نئی کتاب

''اخبار کی راتیں''

کہتے ہیں کہ رات رات بھر جاگ کر کام کرنے والے صحافیوں کی زندگی کی شمع کے دونوں سرے بیک وقت جلتے ہیں۔ یہ لوگ کتنے کم وقت میں کتنی شدید مشقت کرتے ہیں تب کہیں آپ کو صبح صبح دنیا بھر کی خبریں تحریری شکل میں ملتی ہیں۔

رضا علی عابدی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد زندگی کے پندرہ برسوں میں اخبار نویسی کے پیشے میں کیا کیا دیکھا، اُن پر کب اور کیا گزری، حالات کی اونچ نیچ کے ساتھ خود اخبار کی سنورتی بگڑتی صورتِ حال کارکنوں پر کیسے اثر انداز ہوئی۔ اس راہ میں انہیں کیسے کیسے لوگ ملے، اُن کی کیسی کیسی کہانیاں رضا علی عابدی کو آج تک یاد ہیں۔ شہر سے لے کر ملک تک حالات نے کیسی کروٹیں بدلیں اور جنگوں، مظاہروں، احتجاج اور انتخابات نے کیسے منظر دکھائے، کچھ اخبار میں لکھے گئے اور کچھ مصلحتوں کی خاطر ان صفحات کی زینت نہ بن سکے۔

رضا علی عابدی نے اپنی یادداشت کو کھنگال کر اپنی صحافت کی زندگی کی ذرا ذرا سی تفصیل بیان کر دی ہے۔

'اخبار کی راتیں' اُن کی تازہ تصنیف ہے اور زیرِ طباعت ہے۔

Rs. 400.00

www.sang-e-meel.com

www.sang-e-meel.net